اسلام

اور

جدید مسائل

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ اوّل

کچھ عرصے سے اسلام کے سامنے وقت اور بدلے ہوئے زمانے کے بے شمار جدید تقاضے
لا لا کر پیش کیے جا رہے ہیں اور ان کی روشنی میں اسلام کی طرف ترمیم طلب نگاہوں سے
دیکھا جا رہا ہے۔ اسلام کو معیارِ ردّ و قبول بنا کر ان سے ہزار گنا زیادہ تقاضے بھی پیش کیے
جاتے تو اللہ کے فضل سے اس ملک میں ایسے اہل علم و فضل موجود ہیں جو اسلام کی روشنی
میں ان تقاضوں کو اطمینان بخش طور پر حل کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر تہذیبِ مغرب کو معیارِ
ردّ و قبول بنا کر اس کے تقاضے اسلام کے سامنے پیش کیے جائیں، اور اس سے چاہا جائے کہ
وہ اگر اپنی خیریت چاہتا ہے تو خاموشی سے ان تقاضوں پر اپنی تصدیق کا انگوٹھا لگا دے تو
صورتحال بالکل بدل جاتی ہے۔ اسلام اگر ان مطالبوں کی اندھی تصدیق سے انکار کرے تو
اسے دینِ حق کہنے کے بجائے ملّا ازم بنا دیا جاتا ہے بلکہ اسے اپنا ملازم سمجھ کر اس کی ہر بات کو
نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ اور ایک ایسے اسلام کی ضرورت کا جا بجا اشتہار دیا جاتا ہے جو تہذیب
مغرب کا دامن اٹھا کر اس کے پیچھے بیرے کی طرح چل سکے۔ اسلام سے اس نوعیت کے مطالبات
کا ریلا اس گھٹی گھٹی فضا میں اور بڑھ گیا ہے جہاں اشتراکی عناصر نے ثقافتی سرگرمیوں کے نام سے
خاص سرکاری و نیم سرکاری سرپرستی میں الحاد و زندقہ اور فحاشی پھیلانے کی مہم شروع کر رکھی ہے۔
اور اسلام پسند عناصر گھٹے گھٹے ماحول کے سبب خاموش و ساکت ہیں۔ جہاں اوپر نیچے کی طرف
مسلسل ایسے شوشے لٹکائے جاتے ہیں جو اسلام کی تعلیمات کے صریحاً خلاف ہوتے ہیں، جہاں
معاشرے کے اخلاقی و روحانی بگاڑ کے سارے ہی اسباب فراہم ہو رہے ہیں لیکن اصلاحِ احوال و
افکار کی کوئی کوشش بھی منظم طور پر ممکن نہیں ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ پمفلٹ شائع کیا

فہرست موضوعات

- زکوٰۃ یا سرکاری ٹیکس
- بیسویں صدی میں جہاد
- نئی سائنٹیفک ایجادات اور جہاد
- چاند، مریخ اور مشتری پر واسکوڈیگاما
- فوج اور انتظامِ ملکی
- اسلام اور عورتوں کے ملکی مناصب
- مخلوط تعلیم
- سول میرج اور کورٹ شپ
- عورتوں کی رائے دہندگی
- عدالتی فسخِ نکاح
- عورت اور سفارت
- عورت اور اسلامی وراثت
- اسلامی حکومت میں خواتین کی تنظیمیں
- عورت اور فوجی خدمات
- عورت معلمہ، ڈاکٹر، نرس اور ایرہوسٹس
- کھلی کھلی زیبائش اور نیم عریاں لباس
- رقص وسرود اور اسلامی ثقافت
- گرل گائڈ، اپوا اور بلو برڈ
- یوتھ فیسٹول، ناچ، ڈرامے اور مقابلۂ حسن۔
- ضبطِ ولادت اور فیملی پلاننگ
- موت کے بعد انسانی اعضاء کا استعمال اور عطیہ۔
- قرآن وحدیث اور سائنٹیفک حقائق۔
- انسان، بن مانس کی ترقی یافتہ نسل۔
- آفتاب متحرک ہے یا ساکن
- بادل اور فرشتوں کے کوڑے
- آلات کے ذریعہ توالد وتناسل
- امتحانی نلیوں میں انسانی بچے
- اسلام اور آلاتِ موسیقی
- آلاتِ موسیقی کی تجارت

جا رہا ہے۔ تاکہ جو لوگ دیانتداری اور انصاف سے زمانے کے جدید مسائل کو اسلام کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں وہ محروم نہ رہیں۔ اور اگر ان پر حقیقت واضح ہو جائے تو اسے دوسروں کی ذہنی رہنمائی کے لیے کام میں لائیں۔

اسلام اور جدید مسائل

دورِ جدید کی رہنما قوت ——— اسلام یا عیسائیت؟

سوال : "بیسویں صدی کے اس مہذب اور ترقی یافتہ دور کی رہنمائی بھی مذہبی نقطۂ نظر سے اسلام کر سکتا ہے یا عیسائیت؟ کیا انسان کو سیکولرزم یا دہریت روحانی و مادی ترقی کی معراج نصیب کرا سکتی ہے؟ بالخصوص کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے اور ختم کرنے کی صلاحیت کس میں ہے؟"

جواب : یہ سوال کئی سوالات کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اس کے ایک ایک جزو پر علٰحدہ بحث کرنی ہوگی۔

(الف) جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے، اس دور کی رہنمائی سے وہ پہلے ہی دستبردار ہو چکی ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ کسی دور میں بھی انسانی تہذیب و تمدن کی رہنمائی نہیں کر سکی ہے۔ عیسائیت سے مراد اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وہ تعلیمات ہیں جو اب عیسائیوں کے پاس ہیں تو بائبل کے عہدِ جدید کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ وہ انسانی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا رہنمائی اور کتنی رہنمائی کرتی ہے؟ اس میں بجز چند مجرد (ABSTRACT) اخلاقی اصولوں کے اور سرے سے کوئی چیز موجود نہیں ہے جس سے انسان اپنی معاشرت اور اپنی معیشت اور سیاست اور عدالت اور قانون کے متعلق کوئی ہدایت حاصل کر سکے لیکن اگر عیسائیت سے مراد وہ نظامِ زندگی ہے جو عیسائی پادریوں نے بنایا تھا تو سب کو معلوم ہے کہ یورپ میں احیائے علوم کی نئی تحریک کے رونما ہونے کے بعد وہ ناکام ہو گیا۔ اور مغربی قوموں نے اس کے بعد جتنی کچھ بھی مادی ترقی کی وہ عیسائیت کی رہنمائی سے آزاد ہو کر ہی کی ہے۔ اگرچہ اسلام کے

خلاف عیسائیت کا تعصب اور عیسائیت کے ساتھ ایک جذباتی تعلق اُن میں اس کے بعد بھی موجود رہا اور اب بھی ہے۔

(ب) جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ اپنے آغاز ہی سے تمدن و تہذیب کے معاملے میں نہ صرف یہ کہ رہنمائی کرتا رہا ہے بلکہ اس نے خود اپنا ایک مستقل تمدن اور اپنی ایک خاص تہذیب پیدا کی ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق قرآن مجید نے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انسان کو ہدایت نہ دی ہو اور ان ہدایات کے مطابق عملی ادارے قائم نہ کر دیئے ہوں۔ یہ چیزیں جس طرح ساتویں صدی عیسوی میں قابل عمل تھیں، اسی طرح اس بیسویں صدی عیسوی میں بھی قابل عمل ہیں اور ہزاروں برس آئندہ بھی انشاءاللہ قابلِ عمل رہیں گی۔ اس "ترقی یافتہ" دور میں کسی ایسی چیز کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جس کی وجہ سے اسلام آج نہ چل سکتا ہو یا انسان کی رہنمائی نہ کرسکتا ہو۔ جو شخص اس معاملہ میں اسلام کو ناقص سمجھتا ہو، یہ اس کا کام ہے کہ کسی ایسی چیز کی نشاندہی کرے جس کے معاملہ میں اسلام اس کی رہنمائی سے قاصر نظر آتا ہو۔

(ج) سیکولرزم یا دہریت درحقیقت نہ کسی روحانی ترقی میں مددگار ہیں اور نہ مادی ترقی میں معراج نصیب کرنے کا ذکر ہی کیا ہے؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے اہل مغرب نے جو ترقی مادی حیثیت سے کی ہے وہ سیکولرزم یا مادہ پرستی یا دہریت کے ذریعہ سے نہیں کی بلکہ اس کے باوجود کی ہے۔ مختصراً میری اس رائے کی دلیل یہ ہے کہ انسان کوئی ترقی اس کے بغیر نہیں کرسکتا کہ وہ کسی بلند مقصد کے لیے اپنی جان و مال، اپنے اوقات اور محنتوں کی اور اپنے ذاتی مفاد کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو۔ لیکن سیکولرزم اور دہریت ایسی کوئی بنیاد فراہم کرنے سے قاصر ہیں جن کی بنا پر انسان یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہوسکے۔ اسی طرح کوئی انسانی ترقی اجتماعی کوشش کے بغیر نہیں ہوسکتی اور اجتماعی کوشش لازماً انسانوں کے درمیان ایسی رفاقت چاہتی ہے جس میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور ایثار ہو۔ لیکن سیکولرزم اور دہریت میں محبت و

ایثار کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اب یہ ساری چیزیں مغربی قوموں نے مسیحیت سے بغاوت کرنے کے باوجود ان مسیحی اخلاقیات ہی سے لی ہیں جو ان کی سوسائٹی میں روایتاً باقی رہ گئی تھیں۔ ان چیزوں کو سیکولرزم یا دہریت کے حساب میں درج کرنا غلط ہے سیکولرزم اور دہریت نے جو کام کیا ہے وہ یہ کہ مغربی قوموں کو خدا اور آخرت سے بے فکر کر کے خالص مادہ پرستی کا عاشق اور مادّی لذائذ و فوائد کا طالب بنا دیا ہے مگر ان قوموں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جن اخلاقی اوصاف سے کام لیا وہ ان کو سیکولرزم یا دہریت سے نہیں ملے بلکہ اس مذہب ہی سے ملے جس سے وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے اس لیے یہ خیال کرنا سرے سے غلط ہے کہ سیکولرزم یا دہریت ترقی کی موجب ہیں۔ یہ تو اس کے برعکس انسان کے اندر خود غرضی، ایک دوسرے کے خلاف کشمکش اور جرائم پیشگی کے اوصاف پیدا کرتی ہیں جو انسان کی ترقی میں مددگار نہیں بلکہ مانع ہیں۔

(د) کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کی صلاحیت کسی ایسے ہی نظامِ زندگی میں ہو سکتی ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کو اس سے بہتر طریقہ پر حل کر سکے اور اس کے ساتھ انسان کو وہ روحانی اطمینان بھی بہم پہنچا سکے جس کا کمیونزم میں فقدان ہے ایسا نظام اگر بن سکتا ہے تو صرف اسلام کی بنیاد پر بن سکتا ہے۔

الخلافت یا الحکومت

سوال : اگر بیسویں صدی میں بھی اسلامی نظام قابلِ نفاذ ہے تو موجودہ رجحان و نظریات کی جگہ لینے میں جو مشکلات و موانع درپیش ہوں گے ان کا بہترین حل ابن خلدون کے ہر دو نظریہ حکومت و ریاست یعنی الخلافت یا الحکومت کس سے ممکن ہے ؟

جواب :- اس زمانے میں اسلامی نظام کو جو چیز نافذ ہونے سے روک رہی ہے

اور جو رجحانات اور نظریات اس کے راستے میں سدِّ راہ ہیں، ان کا اگر تجزیہ کرکے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ انہیں مسلمان ملکوں پر مغربی قوموں کے طویل سیاسی غلبہ نے پیدا کیا ہے۔ مغربی قومیں جب ہمارے ملکوں پر مسلط ہوئیں تو انھوں نے ہمارے قانون کو ہٹا کر اپنا قانون ملک میں رائج کیا۔ ہمارے نظام تعلیم کو معطل کرکے اپنا نظام تعلیم رائج کیا تمام چھوٹی بڑی ملازمتوں سے ان سب لوگوں کو برطرف کیا جو ہمارے تعلیمی نظام کی پیداوار تھے اور ہر ملازمت ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دی جو ان کے قائم کردہ نظام تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے تھے معاشی زندگی میں بھی اپنے ادارے اور طور طریقے رائج کیے اور معیشت کا میدان بھی رفتہ رفتہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہو گیا جنھوں نے مغربی تہذیب و تعلیم کو اختیار کیا تھا۔ اس طریقہ سے انھوں نے ہماری تہذیب اور ہمارے تمدّن اور اس کے اصولوں اور نظریات سے انحراف کرنے والی ایک نسل خود ہمارے اندر پیدا کر دی جو اسلام اور اس کی تاریخ، اس کی تعلیمات اور اس کی روایات ہر چیز سے علمی طور پر بھی بیگانہ رہے اور اپنے رجحانات کے اعتبار سے بھی بیگانہ۔
یہی وہ چیز ہے جو دراصل ہمارے اسلام کی طرف پلٹنے میں مانع ہے اور یہی اس غلط فہمی کا موجب بھی ہے کہ اسلام اس وقت قابل عمل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ساری تعلیم و تربیت غیر اسلامی طریقے پر دی گئی ہو، وہ آخر اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں کہ اسلام قابل عمل نہیں ہے کیونکہ نہ تو وہ اسلام کو جانتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار کیے گئے ہیں جس نظامِ زندگی کے لیے وہ تیار کیے گئے ہیں اسی کو وہ قابل عمل تصور کر سکتے ہیں۔ اب لامحالہ ہمارے لیے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ یا تو ہم من حیث القوم کافر ہو جانے پر تیار ہو جائیں اور خواہ مخواہ اسلام کا نام لے کر دنیا کو دھوکا دینا چھوڑ دیں۔ یا پھر خلوص اور ایمانداری کے ساتھ (منافقانہ طریق سے نہیں) اپنے موجودہ نظام تعلیم کا جائزہ لیں اور اس کا پورے طریقہ سے تجزیہ کرکے دیکھیں کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہم کو اسلام سے منحرف بنانے والی ہیں اور اس میں کیا تغیرات کیے جائیں جن سے ہم ایک اسلامی نظام کو چلانے کے قابل لوگ تیار کر سکیں۔ مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تعلیمی

کمیشن نے اس مسئلہ کی طرف کوئی اپیشی ہوئی توجہ بھی نہیں کی۔ یہ مسئلہ بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل ہے اور جب تک ہم اسے حل نہیں کر لیں گے اس وقت تک اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ کبھی ہموار نہ کر سکیں گے۔

ابن خلدون کے کسی نظریہ کی طرف رجوع کرنے سے اس مسئلہ کے حل کرنے میں مدد نہیں مل سکتی کیونکہ اس مسئلہ کی جو نوعیت اب پیدا ہوئی ہے وہ ابن خلدون کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مسئلہ کی حقیقی نوعیت یہ ہے کہ مغربی استعمار رخصت ہوتے ہوئے ہمارے ملکوں میں اس نسل کو حکمراں بنا کر چھوڑ گیا ہے جس کو اس نے اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب کا دودھ پلا پلا کر اس طرح تیار کیا تھا گویا کہ وہ جسمانی حیثیت سے تو ہماری قوم کا حصہ ہے لیکن علمی اور ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے انگریزوں، فرانسیسیوں یا ولندیزیوں کا پورا جانشین ہے۔ اس طبقہ کی حکومت جو مشکلات پیدا کرتی ہے ان کو رفع کرنا ایک پیچیدہ معاملہ ہے جسے حل کرنا ابن خلدون کے نظریات کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑے سنجیدہ غور و فکر کی اور حالات کو سمجھ کر اصلاح کے لیے نئی راہیں نکالنے کی ضرورت ہے۔

اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق

سوال : اسلامی مملکت میں اقلیتی فرقوں کو مثلاً عیسائی، یہودی، بدھ، جین پارسی، ہندو وغیرہ کو کیا مسلمانوں کی طرح پورے حقوق حاصل ہوں گے؟ کیا ان کو اپنے مذہب کی تبلیغ بھی اس طرح کرنے کی اجازت ہوگی جیسا کہ آج کل پاکستان اور دیگر ممالک میں کھلے بندوں پرچار ہوتا ہے؟ کیا اسلامی مملکت میں ایسے مذہبی یا نیم مذہبی ادارے مثلاً ادارہ مکتی فوج SALVATION ARMY یا کیتھولک کانونٹ، سینٹ جان و سینٹ فرانسس وغیرہ جیسے ادارے، کیا قانوناً بند کر دیئے جائیں گے؟ (جیسا کہ حال ہی میں سیلون میں ہوا یا دو ایک ممالک میں ہو چکا ہے) یا

فراخدلی سے مسلمان بچوں کو وہاں بھی ماڈرن ایجوکیشن حاصل کرنے کی عام اجازت ہوگی؟

کیا اس صدی میں بھی ان اقلیتی فرقوں سے جزیہ وصول کرنا مناسب ہوگا؟ (عالمی

حقوق انسانی کی روشنی میں بھی) جبکہ وہ نہ صرف فوج اور سرکاری عہدوں پر فائز اور

حکومت کے وفادار ہوں؟"

جواب:۔ اسلامی مملکت میں غیر مسلم گروہوں کو تمام مدنی حقوق (CIVIL RIGHTS) مسلمانوں کی طرح حاصل ہوں گے۔ مگر سیاسی حقوق POLITICAL RIGHTS مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ریاست کے نظام کو چلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور مسلمان اس بات پر مامور ہیں کہ جہاں بھی ان کو حکومت کے اختیارات حاصل ہوں وہاں قرآن اور سنت کی تعلیمات کے مطابق حکومت کا نظام چلائیں۔ چونکہ غیر مسلم نہ قرآن اور سنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اس کی اسپرٹ کے مطابق ایمانداری سے کام چلا سکتے ہیں اس لیے وہ اس ذمہ داری میں شریک نہیں کیے جا سکتے۔ البتہ نظم ونسق میں ایسے عہدے، ان کو دیئے جا سکتے ہیں جن کا کام پالیسی بنانا نہ ہو۔ اس معاملہ میں غیر مسلم حکومتوں کا طرز عمل منافقانہ ہے اور اسلامی حکومت کا طرز عمل صاف صاف ایماندارانہ۔ مسلمان اس بات کو صاف صاف کہتے ہیں کہ وہ اس پر عملدرآمد کرنے میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری ملحوظ رکھتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی شرافت اور فراخدلی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ غیر مسلم بظاہر کاغذ پر قومی اقلیتوں NATIONAL MINORITIES کو سب قسم کے حقوق دے دیتے ہیں۔ مگر عملاً انسانی حقوق تک نہیں دیتے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو دیکھ لے کہ امریکہ میں سیاہ فام لوگوں (NEGROES) کے ساتھ، اور روس میں غیر کمیونسٹ باشندوں کے ساتھ اور چین وہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ خواہ مخواہ دوسروں سے شرما کر ہم اپنے مسلک کو صاف صاف کیوں نہ بیان کریں اور اس پر صاف صاف کیوں نہ عمل کریں۔

جہاں تک غیر مسلموں کی تبلیغ کا معاملہ ہے، اس کے بارے میں یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ

جب تک ہم بالکل خودکشی کیلئے ہی تیار نہ ہو جائیں ہمیں یہ حماقت نہیں کرنی چاہئے کہ اپنے ملک کے اندر ایک طاقت ور اقلیت پیدا ہونے دیں جو غیر ملکی سرمایہ سے پرورش پائے اور بڑھے اور جس کی پشت پناہی بیرونی حکومتیں کر کے ہمارے لیے وہی مشکلات پیدا کریں جو ایک مدتِ دراز تک ترکی کیلیے عیسائی اقلیتیں پیدا کرتی رہی ہیں ۔

عیسائی مشنریوں کو یہاں مدارس اور اسپتال جاری رکھ کر مسلمانوں کے ایمان خریدنے کی کوشش کرنے اور مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنی ملت سے بیگانہ DE-NATIONALISED کرنے کی کھلی اجازت دینا بھی میرے نزدیک قومی خودکشی ہے۔ ہمارے حکمران اس معاملے میں انتہائی کم نظری کا ثبوت دے رہے ہیں ۔ ان کو قریب کے فائدے تو نظر آتے ہیں، مگر دور رس نتائج دیکھنے سے ان کی آنکھیں عاجز ہیں ۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم اس حالت کے لیے دیا گیا ہے جبکہ وہ یا تو مفتوح ہوئے ہوں یا کسی معاہدہ کی رو سے جزیہ دینے کی واضح شرط پر اسلامی حکومت کی رعایا بنائے گئے ہوں۔ پاکستان میں چونکہ یہ دونوں صورتیں پیش نہیں آئی ہیں اس لیے یہاں غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرنا میرے نزدیک شرعًا ضروری نہیں ہے۔

اسلامی حکومت میں متعصب مستشرقین کے افکار کی اشاعت

سوال :- کیا اسلامی ملک میں ان مغربی مستشرقین، غیر مسلم اسکالرز اور پروفیسروں کو تعلیم یا تقریر کے لیے مدعو کیا جا سکتا ہے جنھوں نے اپنے نقطۂ نظر سے اسلام کے موضوعات پر کتابیں لکھتے ہوئے نہ صرف اسلام پر بیجا تنقیدی تبصرے کیے ہیں بلکہ عمدًا یا کم علمی و تعصب سے اسلامی تاریخ لکھنے میں حضورِ اکرمؐ، اہل بیت، خلفائے راشدینؓ، صحابۂ کرامؓ وائمۂ کرام رحمہم اللہ پر اسلام

اور مسلمانوں کو فخر ہے) کی شان میں نازیبا فقرات لکھ کر ہدف ملامت بنایا ہے۔؟ مثلاً امریکی و برطانوی قابل ترین پروفیسروں کی نظرثانی شدہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی دیگر اعتراضات کے علاوہ رسول مقبول کی ازواج مطہرات کو CONCUBINES (لونڈیاں) لکھا ہے۔ ان میں سے اکثر کے یہاں آکر لکچر اور خطبات دینے اور ان کی تشہیر کرنے پر کیا اسلامی حکومت بالکل پابندی عاید نہ کر دے گی ؟ یا ان کتابوں اور زہر آلود لٹریچروں کی ہماری لائبریریوں میں موجودگی گوارا کی جا سکتی ہے ۔؟ حکومت ان کے جوابات و تردید شائع کرنے ، ان کی تصحیح کرانے یا ان سے رجوع کرانے کے لیے کیا اقدام کر سکتی ہے ۔؟

جواب :- یہ زمانے کے انقلابات ہیں ۔ ایک وقت وہ تھا کہ یورپ کے عیسائی اندلس (SPAIN) جا کر مسلمانوں سے انجیل کا سبق لیا کرتے تھے ۔ اب معاملہ الٹا ہو گیا ہے کہ مسلمان یورپ والوں سے پوچھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور اسلام کی تاریخ اور اس کی تہذیب کیا ہے ۔ حتّٰی کہ عربی زبان بھی مغربی مستشرقین سے سیکھی جاتی ہے ۔ مغربی ممالک سے استاد درآمد کر کے ان سے اسلامی تاریخ پڑھوائی جاتی ہے ۔ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ وہ لکھتے ہیں نہ صرف اسے پڑھا جاتا ہے بلکہ اس پر ایمان بھی لایا جاتا ہے حالانکہ یہ لوگ خود اپنے مذہب اور اس کی تاریخ کے متعلق اپنے ہم مذہبوں کے سوا کسی کی رائے کو ذرہ برابر بھی دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے ۔ یہودیوں نے اپنی انسائیکلوپیڈیا (JEWISH ENCYCLOPAEDIA) شائع کی ہے اور اس میں کوئی ایک مضمون (ARTICLE) بھی کسی مسلمان تو در کنار کسی عیسائی مصنف کا بھی نہیں ہے ۔ بائبل کا ترجمہ بھی یہودیوں نے اپنا کیا ہے ۔ عیسائیوں کے ترجمے کو وہ ہاتھ نہیں لگاتے ۔ اس کے برعکس یہودی مصنفین اسلام کے متعلق مضامین اور کتابیں لکھتے ہیں اور مسلمان ہاتھوں ہاتھ ان کو لیتے ہیں اور ان کا یہ حق مانتے ہیں کہ ہمارے مذہب اور ہماری فقہ اور ہماری تہذیب اور ہمارے بزرگوں

کی تاریخ کے متعلق وہ محققانہ کلام فرمائیں اور ہم یہ چیزیں ان سے سیکھیں۔ یہ صورتحال کسی صحیح اسلامی حکومت میں نہیں رہ سکتی اور نہ رہنی چاہئے اور کوئی وجہ نہیں کہ رہ سکے اسلامی حکومت بھی ہو اور اسلام اور مسلمان یتیم بھی ہوں، یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ یہ رویہ مسلمانوں کی غیر اسلامی حکومت ہی کو مبارک رہے۔

غیر مسلم ممالک سے اقتصادی اور صنعتی قرضے

سوال: کیا اسلامی حکومت موجودہ دور میں جب کہ ایک ملک دوسرے ملک سے قطع تعلق کر کے ترقی نہیں کر سکتا، غیر ممالک سے متعلق اقتصادی، فوجی ٹکنیکل امداد یا بین الاقوامی بینک سے شرح سود پر قرض لینا بالکل حرام قرار دے گی؟ پھر مادی، صنعتی، زراعتی وسائنسی ترقی وغیرہ کی جو عظیم خلیج مغربی ترقی یافتہ (ADVANCED) ممالک اور مشرق وسطیٰ بالخصوص اسلامی ممالک یا اس ایٹمی دور میں (HAVE-NOT اور HAVE کے درمیان حائل ہے کس طرح پر ہو سکے گی؟ نیز کیا اندرونِ ملک تمام بینکنگ و انشورنس سسٹم ترک کرنے کا حکم دیا جائے گا؟ سود، پگڑی، منافع و ربوٰا اور گڈول GOODWILL اور خرید و فروخت میں دلالی و کمیشن کے لیے کون سی اجتہادی راہ نکالی جا سکتی ہے؟ کیا اسلامی ممالک آپس میں سود، منافع، ربوٰا وغیرہ پر کسی صورت میں قرض لین دین کر سکتے ہیں ـــ؟

جواب: اسلامی حکومت نے کسی دور میں بھی غیر مسلم ممالک سے قطع تعلق کی پالیسی اختیار نہیں کی اور نہ آج کرے گی۔ لیکن تعلق کے معنی قرض مانگتے پھرنے کے نہیں ہیں، اور وہ بھی ان کی شرائط پر۔ یہ تعلق اس زمانے کے کم ہمت لوگوں نے ہی پیدا کیا ہے

اگر کسی ملک میں ایک صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو وہ مادی ترقی سے پہلے اپنی قوم کی اخلاقی حالت سدھارنے کی کوشش کرے گی۔ اخلاقی حالت سدھرنے کی معنی یہ ہیں کہ قوم کے حکمراں اور اس کی انتظامی مشینری کے کارپرداز اور قوم کے افراد ایماندار ہوں۔ اپنے حقوق سے پہلے اپنے فرائض کو ملحوظ رکھنے اور سمجھنے والے ہوں۔ اور سب کے سامنے ایک بلند نصب العین ہو۔ جس کے لیے جان و مال اور وقت اور محنتیں اور قابلیتیں سب کچھ قربان کرنے کے لیے وہ تیار ہوں۔ نیز یہ کہ حکمرانوں کو قوم پر اور قوم کو حکمرانوں پر پورا اعتماد ہو، اور قوم ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھے کہ اس کے سربراہ درحقیقت اس کی فلاح کے لیے کام کررہے ہیں۔ یہ صورتحال اگر پیدا ہو جائے تو ایک قوم کو باہر سے سود پر قرض مانگنے کی صورت پیش نہیں آسکتی۔ ملک کے اندر جو ٹیکس لگائے جائیں گے وہ سو فیصدی وصول ہوں گے، اور سو فیصدی ہی وہ قوم کی ترقی پر صرف ہوں گے۔ نہ ان کی وصولیابی میں بے ایمانی ہو گی اور نہ ان کے خرچ میں ہی بے ایمانی ہو گی۔ اس پر بھی اگر قرض کی ضرورت پیش آئے تو قوم خود سرمایہ کا ایک بڑا حصّہ رضاکارانہ چندے کی صورت میں اور ایک اچھا خاصہ حصّہ غیر سودی قرض کی صورت میں اور ایک حصّہ منافع میں شرکت کے اصول پر فراہم کرنے کو تیار ہو جائے گی میرا اندازہ یہ ہے کہ پاکستان میں اگر اسلامی اصولوں کا تجربہ کیا جائے تو شاید بہت جلدی پاکستان دوسروں سے قرض لینے کی بجائے دوسروں کو قرضہ دینے کے لیے تیار ہو جائے۔

بالفرض اگر ہمیں بیرونی قوموں سے سود پر قرض لینے کی کوئی ناگزیر صورت پیش آہی جائے یعنی ہمیں اپنی ضرورت کو پورا کرنا بھی لازم ہو اور اس کے لیے ملک میں سرمایہ بھی نہ مل سکے، تو دوسروں سے سود پر قرض لیا جاسکتا ہے لیکن ملک کے اندر سودی لین دین جاری رکھنے کا پھر بھی کوئی جواز نہیں۔ ملک میں سود بند کیا جاسکتا ہے اور پورا مالی نظام (FINANCIAL SYSTEM) سود کے بغیر چلایا جاسکتا ہے۔ میں اپنی کتاب "سود" میں یہ ثابت کرچکا ہوں کہ بینکنگ کا نظام سود کے بجائے منافع میں شرکت (PROFIT SHARING)

کے اصول پر چلایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح انشورنس کے نظام میں ایسی ترمیمات کی جاسکتی ہیں جن سے انشورنس کے سارے فوائد غیر اسلامی طریقے اختیار کیے بغیر حاصل ہوسکیں۔ دلالی، منافع، پگڑی، کمیشن یا گڈول (GOODWILL) وغیرہ کی علٰحدہ علٰحدہ شرعی پوزیشن ہے۔ جب اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آئے گا تو اس کا جائزہ لے کر یا تو سابق پوزیشن بحال رکھی جائے گی، یا پھر ضروری اصلاحات کی جائیں گی۔

نظامِ عدل میں تغیّرات اور ان کی نوعیّت

سوال :- اس برصغیر میں چوں کہ تمام قانونی ضابطہ ہائے دیوانی، فوجداری مالیاتی اور عمل درآمد کے قوانین (PROCEDURAL LAW) وغیرہ عرصہ سے ہر عدالت میں جاری و ساری ہیں۔ اور چوں کہ ڈیڑھ صدی سے تمام لوگ بالخصوص جج و وکلاء وغیرہ نہ صرف ان قوانین سے پوری طرح مانوس بلکہ اس کا وسیع علم رکھتے ہیں۔ اس لیے بھی اسلامی مملکت کے قیام سے جہاں برطانوی دور کے نظامِ عدل (BRITISH RULE OF LAW) کا سارا ڈھانچہ بدلنا ممکن نہ ہوگا۔ تو کیا پھر عدالتی ریفارم لائی جائیں گے۔ جبکہ اسلامی قانون کسی پہلو سے جامع، مرتب یا مکمل اور مدوّن (CODIFIED) نہیں ہے۔ اسلامی عدالتی نظام میں وکلا کی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا اسی طرح PROCEDURAL LAW) کے تحت انہیں مقدمہ جات لڑانے اور مقدمہ بازی LITIGATION کے طول دینے کا اختیار ہوگا؟ کیا اس موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی چور کے ہاتھ کاٹنے اور زانی کو سنگسار کرنے کی سزائیں دی جائیں گی؟ اور کیا قاضیوں کو قانونِ شہادت EVIDENCE LAW کی مدد کے بغیر فیصلے صادر کرنے ہوں گے؟ بین الاقوامی قسم کے ادارے

مثلاً اقوام متحدہ (UNITED NATIONS) کی جنرل اسمبلی، سیکورٹی کونسل،
بین الاقوامی عدالت انصاف یا کمرشل ٹریبونل اور لیبر قوانین وغیرہ کی عملداری و
دخل اندازی یا انٹرنیشنل لا پر عمل پیرا ہونے اور ان کی من وعن قبولیت کے لیے
اسلامی حکومت کا کیا رویہ ہوگا؟ اگر اسی قسم کے ادارے اسلامی کنفیڈریشن یا اسلامی
بلاک بنا کر عمل میں لائے جائیں تو ان کو کیا حیثیت حاصل ہوگی؟ کیا اسلامی
قانون ساز اسمبلی کے پاس شدہ یا اجتہادی احکام پر اسلامی عدلیہ کو نظر ثانی
(REVIEW) کرنے کا اختیار ہوگا؟ اسلامی ممالک اور مسلمانوں کو ایک اسٹیج
پر لانے کے لیے اختلافات کس طرح رفع کیے جا سکتے ہیں؟

جواب:۔ اس سوال کے جواب میں یہ بات پہلے ہی سمجھ لینی چاہئے کہ جب
انگریزی حکومت اس ملک میں آئی تھی تو اس وقت سارا قانونی نظام ۔ LEGAL
SYSTEM اسلامی فقہ پر قائم تھا ۔ انگریزوں نے آکر اس کو یک لخت تبدیل نہیں کیا ۔ بلکہ
انگریزی حکومت میں سالہا سال تک اسلامی نظام ہی چلتا رہا ۔ انگریز اس کو بتدریج تبدیل
کرتے رہے اور رفتہ رفتہ انھوں نے اپنا نظام رائج کیا ۔ اب اگر ہم اسلامی نظام قانون کو
از سر نو قائم کرنا چاہیں تو یہ تبدیلی بھی یک لخت نہیں ، بتدریج ہی ہوگی ۔ اور اس کے لیے
بہت حکمت کے ساتھ ایک ایک قدم اٹھانا پڑے گا ۔ اسلامی قوانین اگر مدون (CODIFIED)
نہیں ہیں تو ان کے مدون CODIFIED کرنے میں کوئی دقت نہیں ہے ۔ اسی طرح اسلامی قانون
کی شرحیں کثرت سے موجود ہیں ۔ ان کو آسانی سے اردو زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور آگے
نئی شرحوں کا سلسلہ چل سکتا ہے ۔

اسی موجودہ ترقی یافتہ دور میں سعودی عرب میں زنا اور چوری کی سزائیں جاری
ہیں اور تجربے نے تمام دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہی سزاؤں کی وجہ سے سعودی عرب میں
جرائم کی اتنی کمی ہو گئی ہے کہ جتنی دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے ۔ اب اگر اس دور کے ترقی یافتہ ہونے

کے معنی یہی ہیں کہ جرائم میں ترقی ہو تو مغربی قانونی سسٹم پر شوق سے عمل کرتے رہیے۔ لیکن جرائم
کا انسداد بھی اگر ترقی کے لیے ضروری ہے تو پھر یہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی قانون
سے زیادہ کارگر کوئی قانون نہیں ہے۔ دراصل اس زمانے کی لادینی تہذیب کی خصوصیات میں سے
ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی ساری ہمدردیاں مجرموں کے ساتھ ہیں۔ اسی لیے یہ نقطہ نظر
پیش کیا جاتا ہے کہ یہ سزائیں وحشیانہ ہیں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ چوری کرنا کوئی وحشیانہ
کام نہیں ہے۔ البتہ اس پر ہاتھ کاٹنا وحشیانہ کام ہے اور زنا کا ارتکاب تو مغربی تہذیب میں ایک
تفریح ہے ہی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس خیال کا ماخذ کیا ہے کہ اسلامی قانون میں قاضیوں کو قانونِ شہادت
EVIDENCE کی مدد کے بغیر فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ یا کوئی ایسا دستور العمل رہا ہے،
حالانکہ خود قرآن نے قانونِ شہادت کے بہت سے اصول بیان کیے ہیں اور اس کی بیشتر تشریحات
حدیث اور خلفائے راشدین کے فیصلوں سے ملتی ہیں۔ بالخصوص فقہاء نے ان اصولوں کو نہایت
محنت سے ترتیب دیا ہے اور اسلامی دور میں کوئی ایسا قاضی نہیں گزرا جس نے ثبوت کے بغیر
فیصلے صادر کیے ہوں۔

وکالت کے بارے میں میرے نزدیک صرف اتنی اصلاح درکار ہے کہ قانون کی پریکٹس
بند کر دی جائے اور وکلاء کو اسٹیٹ معاوضہ دے۔ اب بھی قانون کا نظریہ یہ ہے کہ وکیل کا
اصل کام اپنے موکل کی حمایت کرنا نہیں ہے بلکہ عدالت کو قانون سمجھنے اور منطبق (APPLY)
کرنے میں مدد دینا ہے۔ وکالت کے پیشہ بن جانے کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے کہ وکیل
عدالت کو گمراہ (MISLEAD) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گواہوں کو سکھاتے پڑھاتے
ہیں۔ عدالت کے سامنے مقدمے کی روداد غلط لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مقدمات کو طول
بھی دیتے ہیں اور مقدمہ بازی کو بڑھاتے بھی ہیں۔

بین الاقوامی قسم کے تمام اداروں میں ہم شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کے اندر اگر کوئی چیز بھی

ہمارے اصول کے مطابق نہ ہوگی تو ہم اس کی حد تک اپنی الگ پالیسی بنائیں گے اور اسی حد تک ہماری شرکت میں استثنا ہوگا۔ مسلمان ممالک اپنی خود دولت متحدہ COMMONWEALTH یا تحالف (CONFEDERATION) بنا سکتے ہیں اور اسلامی اصول کے مطابق باہمی تعلقات کے طریقے مقرر کر سکتے ہیں۔

اسلامی قانون ساز اسمبلی کے طے کیے ہوئے اجتہادی احکام پر اسلامی عدلیہ نظرثانی (REVIEW) نہیں کر سکتی۔ البتہ اگر وہ احکام قانون ساز اسمبلی کے اختیار سے متجاوز ہوں تو ان کو حدودِ اختیار سے متجاوز قرار دے سکتی ہے۔

اسلامی ممالک اور مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر لانے کے لیے اختلافات رفع کرنے کی صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان ایمانداری کے ساتھ قرآن اور سنت کی ہدایات پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔ قرآن کی تاویل اور سنت کی تحقیق میں اختلافات ہو سکتے ہیں، لیکن وہ مل کر کام کرنے میں مانع نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم اس اصول کو مان لیں کہ جو شخص بھی قرآن اور سنت کو سند وحجت (AUTHORITY) مان لے اور حضورؐ سرور کائنات کے بعد کسی دوسری نبوت کا قائل نہ ہو وہ ہماری برادری کا آدمی ہے، تو یہ چیز کسی آدمی کو ہماری برادری سے خارج نہیں کر سکتی۔ کہ وہ قرآن کے معنی ہم سے مختلف سمجھ رہا ہے اور اس کے نزدیک کسی معاملہ میں سنت سے کوئی اور بات ثابت ہوتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جتنی عدالتیں بھی پاکستان کے دستور اور قانون کو واجب الاطاعت قانون مان کر کام کرتی ہیں وہ سب اس ملک کی جائز عدالتیں ہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہے کہ تمام عدالتوں کے فیصلے بھی یکساں ہوں۔

اجتہاد اور اس کے تقاضے

سوال :- کیا اجتہاد کے اس دروازے کو جسے صدیوں پیشتر بند کر دیا گیا

تھا۔ آج کھولنے کی شدید ضرورت نہیں ہے ؟ اور وہ اجتہادی اصول جو آج سے ہزاروں سال قبل بنائے گئے تھے کیا ان کو بڑی سختی سے آج بیسوی صدی کے مسائل پر بھی نافذ کیا جائے گا ؟ حکومت اس صورت حال سے کس طرح نمٹے گی جبکہ ہر طبقۂ فکر یعنی (SUB SECTS) کے پیرو اپنے ائمہ کے اجتہادی احکام کو بدلنے کے خلاف ہیں اور نہایت شدومد سے آج کے مسائل کے لیے بھی انہی کی تشریح وتوضیح کر کے فیصلے کرنے کے حق میں ہیں ؟ اگر ہر مکتب فکر کے علماء کو اکثریت آرا سے اجتماعی طور پر "اجماع" کے لیے مامور کیا جائے، تو کیا جو "اجتہاد" اس طرح کیا گیا ہو وہ تمام مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہوگا ؟ کیا حکومت کو اس پر سختی سے عمل پیرا ہونے پر مجبور کیا جا سکے گا ؟ خلاف ورزی و مخالفت اور نکتہ چینی کہاں تک برداشت ہو سکتی ہے ؟ کیا حضرت علیؓ و جعفر صادقؒ و شیعہ ائمہ کا اجتہاد اور قوانین جو نہایت مناسب ہیں، تمام مسلمانوں کے لیے اسلامی حکومت نافذ کر سکتی ہے ؟

جواب :۔ یہ سوال بہت سے اصولی سوالات پر مشتمل ہے، میں اس کے ایک ایک جزو کا جواب نمبر وار دوں گا :

(الف) اجتہاد کا دروازہ کھولنے سے کسی ایسے شخص کو انکار نہیں ہو سکتا جو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں ایک اسلامی نظام کو چلانے کے لیے اجتہاد کی اہمیت و ضرورت کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ لیکن اجتہاد کا دروازہ کھولنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی احتیاط کا متقاضی بھی ہے۔ اجتہاد کرنا ان لوگوں کا کام نہیں ہے جو ترجموں کی مدد سے قرآن پڑھتے ہوں، حدیث کے پورے ذخیرے سے نہ صرف یہ کہ ناواقف ہوں، بلکہ اس کو دفتر بے معنی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہوں۔ پچھلی تیرہ صدیوں میں فقہائے اسلام نے اسلامی قانون پر جتنا کام کیا ہے اس سے سرسری واقفیت بھی نہ رکھتے ہوں اور اس کو بھی فضول سمجھ کر پھینک دیں۔ پھر اس پر مزید یہ کہ مغربی

نظریات و افکار کو لے کر ان کی روشنی میں قرآن کی تاویلیں کرنا شروع کر دیں۔ اس طرح کے لوگ اگر اجتہاد کریں گے تو اسلام کو مسخ کر کے رکھ دیں گے اور مسلمان جب تک اسلامی شعور کی رمق بھی ان کے اندر موجود ہے ایسے لوگوں کے اجتہاد کو ہرگز ضمیر کے اطمینان کے ساتھ قبول نہ کریں گے۔ اس طرح کے اجتہاد سے جو قانون بھی بنایا جائے گا وہ صرف ڈنڈے کے زور سے ہی قوم پر مسلط کیا جا سکے گا اور ڈنڈے کے ساتھ ہی وہ رخصت ہو جائے گا۔ قوم کا ضمیر اس کو اس طرح اگل کر پھینک دے گا جس طرح انسان کا معدہ نگلی ہوئی مکھی کو اگل کر پھینک دیتا ہے۔ مسلمان اگر اطمینان کے ساتھ کسی اجتہاد کو قبول کر سکتے ہیں تو وہ صرف ایسے لوگوں کا اجتہاد ہے جن کے علمِ دین، خدا ترسی اور احتیاط پر ان کو اطمینان اور بھروسہ ہو۔ اور جن کے متعلق وہ یہ جانتے ہوں کہ یہ لوگ غیر اسلامی نظریات و تصورات کو اسلام میں نہیں ٹھونسیں گے

(ب) جو اجتہادی اصول آج سے ہزار سال پہلے بنائے گئے تھے وہ صرف اس لیے رد کر دینے کے قابل نہیں ہیں کہ وہ ہزار سال پرانے ہیں۔ معقولیت کے ساتھ جائزہ لے کر دیکھیے کہ وہ اصول تھے کیا، اور اس بیسویں صدی میں ان کے سوا اور کچھ اصول ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ ان میں سے پہلا اصول یہ تھا کہ آدمی اس زبان کو، اور اس کے قواعد اور محاوروں اور ادبی نزاکتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ بتائیے، کیا یہ اصول غلط ہے؟ انگریزی زبان میں قانون کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں کیا ان کی تعبیر کا حق کسی ایسے شخص کو دیا جا سکتا ہے جو انگریزی زبان کی ایسی ہی واقفیت نہ رکھتا ہو؟ وہاں تو ایک کاما (COMMA) کے اِدھر سے اُدھر ہو جانے سے معنی میں عظیم فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بسا اوقات ایک کاما کی تبدیلی کے لیے پارلیمنٹ کو ایک قانون (ACT) پاس کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہاں یہ مطالبہ ہے کہ قرآن کی وہ لوگ تعبیر کریں گے جو ترجموں کی مدد سے قرآن سمجھتے ہوں اور ترجمے بھی وہ جو انگریزی زبان میں ہیں۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ آدمی نے قرآن مجید کا اور ان حالات کا جن میں قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ گہرا اور وسیع مطالعہ کیا ہو، کیا اس اصول میں کوئی غلطی ہے؟ کیا موجودہ قوانین کی تعبیر کا حق کسی ایسے شخص

کو دیا جا سکتا ہے جس نے قانون کی کسی کتاب کا محض سرسری مطالعہ کیا ہو یا اس کا محض ترجمہ پڑھ لیا ہو۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ آدمی اس عمل درآمد سے اچھی طرح واقف ہو جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی قوانین پر ہوا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ قرآن خلا میں سفر کرتا ہوا براہ راست ہمارے پاس نہیں پہونچ گیا ہے۔ اس کو خدا کی طرف سے ایک نبی لایا تھا۔ اس نبی نے اس کی بنیاد پر افراد تیار کیے تھے، معاشرہ بنایا تھا، ایک ریاست قائم کی تھی، ہزارہا آدمیوں کو اس کی تعلیم دی تھی اور اس کے مطابق کام کرنے کی تربیت دی تھی ان ساری چیزوں کو آخر کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ان کا جو ریکارڈ موجود ہے۔ اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف قرآن کے الفاظ سے احکام نکالنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ آدمی اسلامی قانون کی پچھلی تاریخ سے واقف ہو، وہ یہ جانے کہ یہ قانون کس طرح ارتقا کرتا ہوا آج ہم تک پہونچا ہے۔ پچھلی تیرہ صدیوں میں صدی بہ صدی اس پر کیا کام ہوا ہے اور مختلف زمانوں میں وقت کے حالات پر قرآن اور سنت کے احکام کو منطبق کرنے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے گئے ہیں اور تفصیلاً کیا احکام مرتب کیے جاتے رہے ہیں۔ اس تاریخ اور اس کام سے واقف ہوئے بغیر اجتہاد کر کے ہم اسلامی قانون کے ارتقا، کا تسلسل CONTINUITY آخر کس طرح برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ایک نسل اگر یہ طے کر لے کہ پچھلی نسلوں کے کیے ہوئے سارے کاموں کو چھوڑ دے گی اور نئے سرے سے اپنی عمارت بنائے گی تو ایسا ہی احمقانہ فیصلہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں بھی کر سکتی ہیں۔ ایک دانش مند قوم اپنے اسلاف کے لیے ہوئے کام کو برباد نہیں کرتی۔ بلکہ جو کچھ انھوں نے کیا ہے اس کو لے کر آگے وہ کام کرتی ہے جو انھوں نے نہیں کیا اور اس طرح مسلسل ترقی جاری رہتی ہے۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ آدمی ایمانداری کے ساتھ اسلامی اقدار اور طرز فکر اور خدا اور رسولؐ کے احکام کی صحت کا معتقد ہو اور رہنمائی کے لیے اسلام سے باہر نہ دیکھے۔ بلکہ اسلام کے اندر ہی رہنمائی حاصل کرے۔ یہ شرط ایسی ہے جو دنیا کا ہر قانون اپنے اندر اجتہاد کرنے کے لازمی طور پر لگائے گا۔ درحقیقت اجتہاد کے یہی

پانچ اصول ہیں۔ اگر کوئی صاحب معقول دلیل سے اس بیسویں صدی کے لیے کچھ اور اصول تجویز کر سکیں تو ہم ان کے ممنونِ احسان ہوں گے۔

(ج) مسلمانوں میں فرقوں کے جتنے اختلافات ہیں ان کے بارے میں پہلے ہی پاکستان کے علماء اس بات پر اتفاق کر چکے ہیں کہ جہاں تک پرسنل لا کا تعلق ہے ہر فرقے پر وہی احکام نافذ ہوں گے جو اس فرقے کے نزدیک مسلّم ہیں۔ اور جہاں تک ملکی قوانین کا تعلق ہے وہ اکثریت کے مسلک کے مطابق ہوں گے۔ کیا اس کے بعد وہ مشکلات باقی رہتی ہیں جن کا حوالہ دیا جاتا ہے؟ اگر مجلس قانون ساز میں ہمارے نمائندے احتیاط کے ساتھ اس اصول پر عمل کریں تو فرقہ وارانہ اختلافات آہستہ آہستہ کم ہوتے چلے جائیں گے اور ہمارے قوانین کا ارتقاء بڑی اچھی طرح ہو سکے گا۔

(د) فقہ جعفری اور شیعہ علماء کا اجتہاد اسی ملک میں نافذ کیا جا سکتا ہے جہاں شیعہ فرقے کی اکثریت ہو۔ چنانچہ ایران میں وہ نافذ ہے لیکن پاکستان میں وہ شیعوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے ہی رہ سکتا ہے۔ سنی اکثریت پر اس کو نافذ کرنے کی کیسے کوشش کی جا سکتی ہے؟

مسئلہ اجتہاد میں الفاظ اور رُوح کی حیثیت

سوال :- کیا "اجتہاد" جو کیا جائے گا وہ قرآن و حدیث اور سابقہ اجتہادی احکام و قوانین جو خلفائے راشدین کے عہد میں نافذ کیے گئے تھے ان کے محض الفاظ پر ہی زور دے کر عمل کیا جائے گا یا آیت و حدیث کی صحیح اسپرٹ کو مدنظر رکھ کر کہ کن اور کب اور کون سے حالات و احوال و رجحان کے تحت وہ جاری ہوں؟ آج موجودہ قانونی دفعات میں بھی الفاظ- WORDING OF THE SECTION

کی بندش جتنی اہمیت رکھتی ہے اس سے زیادہ دیباچہ قانون PREAMBLE اہمیت رکھتا ہے جس کی روشنی میں آئین وقانون کی دفعات تک کالعدم قرار دیدی جاتی ہیں۔ فرض کیجئے جیسا کہ مسلمان روزہ طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک رکھتے ہیں۔ لیکن نماز، روزہ کے لیے اوقات کا تعین قطبین (POLARS) پر رہنے والے مسلمانوں کے لیے کیا ہوگا جہاں مہینوں لمبی راتیں اور دن ہوتے ہیں۔؟ اور فرض کیجئے کہ کسی خطہ میں قربانی کے لیے گائے بیل، اونٹ، بھیڑ، بکری، دنبہ وغیرہ دستیاب نہ ہوتے ہوں اور مثلاً وہاں صرف سؤر، خرگوش، مچھلی، گینڈے، ہاتھی اور کتے وغیرہ موجود ہوں یا کچھ نہ ہو، تو وہاں قربانی کی کیا صورت ہوگی؟ کیا قربانی کی صحیح اسپرٹ اور اصل جذبے کے تحت جانور جتنی مالیت رقم کی صورت میں حکومت وقت کے بیت المال میں اگر جمع کر دی جائے یا قوم کی فلاح وبہبود پر خرچ کر دی جائے تو کیا شریعت اس پر اکتفا کر لے گی؟

جواب :- اجتہاد کے لیے الفاظ اور اسپرٹ دونوں ہی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ لیکن اسپرٹ کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔ اگر اسپرٹ سے مراد وہ چیز ہے جو بحیثیت مجموعی قرآن کی تعلیمات، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل، خلفائے راشدین کے عمل اور بحیثیت مجموعی فقہائے امت کے فہم سے ظاہر ہوتی ہے، تو بلاشبہ یہ اسپرٹ ملحوظ رکھنے کے قابل ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر الفاظ قرآن اور سنت سے لیے جائیں اور اسپرٹ کہیں اور سے لائی جائے تو یہ سخت قابلِ اعتراض چیز ہے اور ایسی اسپرٹ کو ملحوظ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم خدا اور رسول کا نام لے کر ان سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔

قطبین کے متعلق روزہ اور نماز کے معاملہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ قرآن اور حدیث

رُو سے اصل مقصود خدا کی عبادت ہے۔ یا ان دونوں عبادتوں کو ان خاص اوقات کے اندر ادا کرنا جن کی علامات قرآن اور سنت میں بتائی گئی ہیں؟ تمام دنیا کا یہ مسلّم قاعدہ ہے کہ کسی حکم سے جو اصل مقصود ہو وہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اگر اس حکم کے متعلقات میں سے کوئی چیز ایسی آجائے جس کی پابندی کرنے کے ساتھ حکم کے مقصد کو پورا نہ کیا جا سکتا ہو تو مقصد میں ترمیم کرنے کے بجائے ان متعلقات میں ترمیم کی جائے گی۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ قرآن مجید ار سنت کی رو سے نماز ادا کرنا اور روزہ رکھنا اصل مقصد ہے اور جو اوقات ان عبادتوں کے لیے مقرر کیئے گئے ہیں وہ زمین کی بہت بڑی آبادی کی سہولت کو ملحوظ رکھ کر مقرر کیئے گئے ہیں۔ زمین کی آبادی کا بہت بڑا حصہ اُن علاقوں میں آباد ہے جہاں رات دن کا الٹ پھیر چوبیس گھنٹوں میں ہو جاتا ہے۔ اور ان علاقوں میں چونکہ اکثر بیکے پاس ہر وقت گھڑی نہیں رہ سکتی اس لیے ان کی سہولت کو مدنظر رکھ کر اوقات عبادت کے لیے وہ علامات بیان کی گئی ہیں جو افق پر یا آسمان پر ظاہر ہونے والی ہیں تاکہ ہر انسان اپنی عبادت کے اوقات بآسانی معلوم کرے۔ قطبین پر انسانی آبادی کا بہت چھوٹا حصّہ آباد ہے۔ اس آبادی کو نماز اور روزے کے احکام پر عمل کرنے کے لیے اپنے حالات کے لحاظ سے اوقات مقررہ میں مناسب ترمیمیں کرنی ہوں گی۔ کیونکہ ان اوقات کی پابندی اور عبادت کی ادائیگی دونوں ایک ساتھ نہیں ہو سکتیں۔ ظاہر ہے کہ عبادت کے حکم کو اوقات کے حکم پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ قربانی کے حکم پر عمل کرنے کے لیے صرف دو اصول مدنظر رکھنے ہوں گے ایک تو یہ کہ جانور وہ ہو جو اسلام میں حرام نہیں کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ جانور وہ ہو جو کسی آبادی میں مویشی کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہو۔ اس طرح قربانی کے نام پر دنیا کی آبادی میں عمل کیا جا سکتا ہے۔ قربانی بہرحال جانور ہی کی ہونی چاہیئے۔ اس کے بارے میں کوئی مالی انفاق کی شکل اختیار نہیں کی جا سکتی۔ میں اس موضوع پر تفصیلی بحث اپنے رسالے "مسئلۂ قربانی" میں کر چکا ہوں۔

زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق

سوال :۔ موجودہ آزاد تمدنی دور میں بھی کیا غربا و مساکین کے لیے امراء و رؤسا سے زکوٰۃ فنڈ جبراً وصول کیا جانا مناسب ہوگا، جبکہ وہ دیگر کئی ٹیکسوں کے علاوہ انکم ٹیکس بھی ادا کرتے ہوں ؟

جواب :۔ زکوٰۃ کے متعلق پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ یہ ٹیکس نہیں ہے بلکہ ایک عبادت اور رکن اسلام ہے۔ جس طرح نماز، روزہ اور حج ارکان اسلام ہیں جس شخص نے بھی کبھی قرآن مجید کو آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ دیکھ سکتا ہے کہ قرآن بالعموم نماز اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے اور اسے دین کا ایک رکن قرار دیتا ہے۔ جو ہر زمانے میں انبیاء کرام کا دین رہا ہے اس لیے اس کو ٹیکس سمجھنا اور ٹیکس کی طرح اس سے معاملہ کرنا پہلی بنیادی غلطی ہے۔ ایک اسلامی حکومت جس طرح اپنے ملازموں سے دفتری کام اور دوسری خدمات لے کر یہ نہیں کہہ سکتی کہ اب نماز کی ضرورت باقی نہیں، کیونکہ انھوں نے سرکاری ڈیوٹی دے دی ہے اسی طرح وہ لوگوں سے ٹیکس لے کر یہ نہیں کہہ سکتی کہ اب زکوٰۃ کی ضرورت باقی نہیں کیونکہ ٹیکس لے کیا گیا ہے۔ اسلامی حکومت کو اپنے نظام الاوقات لازماً اس طرح مقرر کرنے ہونگے تاکہ اس کے ملازمین نماز وقت پر ادا کرسکیں۔ اسی طرح اس کو اپنے ٹیکسیشن کے نظام میں زکوٰۃ کی جگہ نکالنے کے لیے مناسب ترمیمات کرنی ہوں گی

اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ حکومت کے موجودہ ٹیکسوں میں کوئی ٹیکس اُن مقاصد کے لیے اس طرح استعمال نہیں ہوتا ہے جن کے لیے قرآن میں زکوٰۃ فرض کی گئی ہے اور جس طرح اس کے تقسیم کرنے کا حکم ہے ۔

بیسویں صدی اور جذبۂ جہاد

سوال :۔ مسلمانوں کے جذبۂ "جہاد" کو زندہ رکھنے کے لیے آج بیسویں صدی میں کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے گا جبکہ آج کی جنگ شمشیر وسناں سے یا میدان جنگ میں صف آرا، ہوکر دست بدست نبرد آزمائی سے نہیں ہوتی بلکہ سائنسی ہتھیاروں، دماغوں STRATEGY اور ESPIONAGE سے لڑی جاتی ہے۔ آپ ایٹم بم، راکٹ، میزائل اور مشینی ایجادات وغیرہ کا سہارا لے کر اس سائنسی و ایٹمی دور میں "جہاد" کی تشریح کس طرح کریں گے ؟

جواب :۔ جہاد کے متعلق اولین بات یہ سمجھ لینی چاہئیے کہ جہاد اور لڑاکا پن میں بہت فرق ہے۔ اسی طرح قومی اغراض کے لیے جہاد اور چیز ہے اور جہاد فی سبیل اللہ اور چیز، مسلمانوں میں جس جذبۂ جہاد کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے وہ اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک ان کے اندر ایمان ترقی کرتے کرتے اس حد تک نہ پہونچ جائے کہ وہ خدا کی زمین سے برائیوں کو مٹانے اور اس زمین میں خدا کا حکم بلند کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ سردست تو ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ سب کچھ اس جذبے کی جڑ کاٹ دینے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ تعلیم وہ دی جارہی ہے جو ایمان کے بجائے شک اور انکار پیدا کرے۔ تربیت وہ دی جارہی ہے جس سے افراد اور سوسائٹی میں وہ برائیاں پھیلیں جنھیں ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام کے نزدیک برائیاں ہیں۔ اس کے بعد یہ سوال لاحاصل ہے کہ مسلمانوں میں جذبۂ جہاد کیسے پیدا ہوگا۔ موجودہ حالات میں یا تو مسلمان کرائے کا سپاہی MERCENARY بنے گا یا محدود قومی اغراض کے لیے لڑے گا۔ رہے سائنسی ہتھیار اور اسٹریٹیجی STRATEGY تو وہ اسباب ہیں جو جائز اغراض اور ناجائز اغراض سب کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں اگر مسلمان میں سچا ایمان موجود ہو اور اسلام کا نصب العین اس کا اپنا نصب العین بن جائے تو وہ

پورے جذبے کے ساتھ تمام وہ قابلیتیں اپنے اندر پیدا کرے گا جو اس زمانے میں لڑنے کیلئے درکار ہیں۔ اور تمام ان ذرائع اور وسائل سے کام لے گا جو آج یا آئندہ جنگ کے لیے درکار ہوں۔

سوال :- کیا چاند اور مریخ و مشتری پر اترنے اور سٹلائٹ چھوڑنے یا فضا میں راکٹ سے پرواز کرنے اور نت نئی ایجادات کرنے والے مجاہدوں کے زمرے میں آسکتے ہیں - ؟

جواب :- چاند اور مریخ اور مشتری پر اترنا اپنی نوعیت کے لحاظ سے کولمبس کے امریکہ پر اترنے اور واسکوڈی گاما کے جزائر شرق الہند پر اترنے سے زیادہ مختلف نہیں۔ اگر وہ لوگ مجاہد فی سبیل اللہ مانے جا سکتے ہیں تو چاند اور مریخ پر اترنے والے بھی مجاہدین بن جائیں گے۔

فوج اور انتظامِ ملکی

سوال :- انتظامی امور و ملکتی نظام - CIVIL ADMINISTRATION میں فوج کو کیا مقام دیا جاسکتا ہے ؟ موجودہ دور کے فوجی انقلابات سے ملکی نظام میں فوج کی شمولیت اور افادیت بہت حد تک ثابت ہو چکی ہے۔ کیوں نہ فوج کو دورِ امن میں بٹھا کر کھلانے کے بجائے ہر فیلڈ میں قوم کی خدمت سپرد ہو ؟

جواب :- انتظامی امور اور ملکتی نظام CIVIL ADMINISTRATION میں فوج کا داخل ہونا فوج کے لیے بھی اور ملک کے لیے بھی سخت تباہ کن ہے۔ فوج بیرونی دشمنوں سے ملک کی حفاظت کرنے کے لیے منظم کی جاتی ہے۔ ملک پر حکومت

کرنے کے لیے منظم نہیں کی جاتی۔ اس کو تربیت دشمن سے لڑنے کی دی جاتی ہے۔ اس تربیت سے پیدا ہونے والے اوصاف ملک کے باشندوں سے معاملہ کرنے کے لیئے موزوں نہیں ہوتے۔ علاوہ بریں ملکی معاملات کو جو لوگ بھی چلائیں خواہ وہ سیاست کار (POLITICIAN) ہوں یا ملکی نسق کے منتظم "CIVIL ADMINISTRATION" ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ ملک میں بہت سے لوگ ان سے خوش بھی ہوتے ہیں اور ناراض بھی، فوج کا اس میدان میں اترنا لامحالہ فوج کو غیر ہر دلعزیز "UNPOPULAR" بنانے کا موجب ہوگا حالانکہ فوج کے لیے یہ ضروری ہے کہ سارے ملک کے باشندے اس کی پشت پر ہوں، اور جنگ کے موقع پر ملک کا ہر فرد اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو۔ موجودہ دور کے فوجی انقلابات نے ملکی نظام میں فوج کی شمولیت کو مفید ثابت نہیں کیا ہے بلکہ درحقیقت تجربے سے اس کے برے نتائج ثابت ہو گئے ہیں۔

اسلام اور خواتین کے ملکی مناصب

سوال: کیا اس دور میں اسلامی حکومت خواتین کو مردوں کے برابر سیاسی معاشی و معاشرتی حقوق ادا نہ کرے گی جبکہ اسلام کا دعوی ہے کہ اس نے سب سے تاریک ترین دور میں بھی عورت کو ایک مقام (STATUS) عطا کیا؟

ا: کیا آج خواتین کو مردوں کے برابر اپنے ووٹ کا حصہ لینے کا حق دیا جا سکتا ہے؟

ب: کیا ان کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم با مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے ملک و قوم کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کی اجازت نہ ہوگی؟

ج: فرض کیجئے اگر اسلامی حکومت خواتین کو برابر کا حق رائے دہندگی دے اور وہ کثرت آراء سے وزارت و صدارت کے عہدوں کے لیے الیکشن لڑ کر کامیاب

ہو جائیں تو موجودہ بیسویں صدی میں بھی ان کو منصب اعلیٰ سنبھالنے کا حق اسلامی احکام کی رو سے نہیں مل سکتا جب کہ بہت سی مثالیں ایسی آج موجود ہیں۔ مثلاً سیلون میں وزارت عظمیٰ ایک عورت کے پاس ہے۔ یا نیدرلینڈ میں ایک خاتون ہی حکمران اعلیٰ ہے۔ برطانیہ پر ملکہ کی شہنشاہیت ہے۔

د : سفارتی حد تک جیسے عابدہ سلطانہ دختر نواب آف بھوپال رہ چکی ہیں اور اب بیگم رعنا لیاقت علی خاں نیدرلینڈ میں سفیر ہیں۔ یا دیگر جس طرح مسز وجے لکشمی پنڈت برطانیہ میں ہائی کمشنر ہیں اور اقوام متحدہ کی صدر رہ چکی ہیں۔ اور بھی مثالیں جیسے نور جہاں، جھانسی کی رانی، رضیہ سلطانہ، حضرت محل زوجۂ واجد علی شاہ جو کہ "PRIDE OF WOMEN" کہلاتی ہیں جنھوں نے انگریزوں کے خلاف لکھنؤ میں جنگ کی کمانڈ کی اور اس طرح خواتین نے خود کو پورا اہل ثابت کر دیا ہے۔ تو اگر آج محترمہ فاطمہ جناح صدارت کا عہدہ سنبھال لیں تو اسلامی اصول پاکستان کے اسلامی نظام میں اس کی اجازت نہ دیں گے۔؟

ر : کیا آج بھی خواتین کو ڈاکٹر وکلا، مجسٹریٹ، جج، فوجی افسر یا پائیلٹ وغیرہ بننے کی مطلق اجازت نہ ہوگی؟

س : خواتین کا یہ بھی کارنامہ کہ وہ نرسوں کی حیثیت سے کس طرح مریضوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں خود اسلام کی پہلی جنگ میں خواتین نے مجاہدین کی مرہم پٹی کی، پانی پلایا اور حوصلے بلند کیے۔ تو کیا آج بھی اسلامی حکومت میں آدھی قوم کو مکانات کی چاردیواری میں مقید رکھا جائے گا؟

ش : کیا عورتیں لیڈی ڈاکٹر یا نرس یا معلمہ بن سکتی ہیں، جیسا کہ ہماری قوم کے بڑے بڑے لیڈروں نے قوم کو اپیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری عورتیں ان سب کاموں میں حصہ لے کر گذشتہ نقصانات اور پسماندگی کی تلافی کریں

اسلامی نقطۂ نظر سے عورتیں کیا ان مشاغل کو اختیار کر سکتی ہیں اور آیا انھیں پردہ میں رہ کر ہی انجام دینا ہوگا یا ضرورۃً پردہ سے باہر بھی آسکتی ہیں - ؟

ص : کیا عورتیں چہرہ کھول کر یا نقاب کے ساتھ جہاد میں شرکت کر سکتی ہیں — ؟

جواب : اسلامی حکومت دنیا کے کسی معاملے میں بھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر کوئی کام کرنے کی نہ تو مجاز ہے اور نہ وہ اس کا ارادہ ہی کر سکتی ہے۔ اگر فی الواقع اس کو چلانے والے ایسے لوگ ہوں جو کہ اسلام کے اصولوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں۔ عورتوں کے معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد عزت و احترام کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اخلاقی معیار کے لحاظ سے بھی برابر ہیں لیکن دونوں کا دائرۂ عمل ایک نہیں ہے۔ سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اسی طرح کے دوسرے کام مرد کے دائرۂ عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دائرے میں عورت کو گھسیٹ لانے کے دو برُے نتیجے ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ ہماری خانگی زندگی بالکل تباہ ہوگی جس کی بیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یا پھر عورتوں پر دوہرا بار ڈالا جائے گا کہ وہ اپنے فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً شریک نہیں ہو سکتا اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں۔ عملاً یہ دوسری صورت ممکن نہیں ہے لازماً پہلی ہی رونما ہوگی اور مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ رونما ہو چکی ہے۔ آنکھیں بند کر کے دوسروں کی حماقتوں کی نقل اتارنا عقلمندی نہیں ہے۔

اسلام میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وراثت میں عورت کا حصّہ مرد کے برابر ہو۔ اس باب میں قرآن کا صریح حکم مانع ہے۔ نیز یہ انصاف کے بھی خلاف ہے کہ عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو۔ کیونکہ اسلامی احکام کی رُو سے خاندان کی پرورش کا سارا مالی بار مرد پر ڈالا گیا ہے۔ بیوی کا مہر و نفقہ بھی اس پر واجب ہے۔ اس کے مقابلہ میں عورت پر کوئی

مالی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس صورت میں آخر عورت کو مرد کے برابر حصّہ کیسے دلایا جاسکتا ہے۔؟

اسلام اصولاً مخلوط سوسائٹی کا مخالف ہے۔ اور کوئی ایسا نظام جو خاندان کو اہمیت دیتا ہو، اس کو پسند نہیں کرتا کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط سوسائٹی ہو۔ مغربی ممالک میں اس کے بدترین نتائج ظاہر ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے لوگ ان نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار ہوں تو شوق سے بھگتتے رہیں لیکن آخر یہ کیا ضروری ہے کہ اسلام میں ان افعال کی گنجائش زبردستی نکالی جائے جن سے وہ شدّت کے ساتھ روکتا ہے۔

اسلام میں اگر جنگ کے موقع پر عورتوں سے مرہم پٹی وغیرہ کا کام لیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امن کی حالت میں عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں اور کلبوں اور پارلیمنٹوں میں لاکھڑا کیا جائے۔ مرد کے دائرۂ عمل میں آکر عورتیں کبھی مردوں کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے کہ وہ ان کاموں کے لیے بنائی ہی نہیں گئی ہیں۔ ان کاموں کے لیے جن اخلاقی اور ذہنی اوصاف کی ضرورت ہے وہ دراصل مرد میں پیدا کیے گئے ہیں عورت مصنوعی طور پر مرد بن کر کچھ تھوڑا بہت ان اوصاف کو اپنے اندر ابھارنے کی کوشش کرے بھی تو اس کا دوہرا نقصان خود اس کو بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی۔ اس کا اپنا نقصان یہ ہے کہ وہ نہ پوری عورت رہتی ہے، نہ پوری مرد بن سکتی ہے اور اپنے اصل دائرۂ عمل میں جس کے لیے وہ فطرۃً پیدا کی گئی ہے ناکام رہ جاتی ہے۔ معاشرہ اور ریاست کا نقصان یہ ہے کہ وہ اہل کارکنوں کے بجائے نااہل کارکنوں سے کام لیتا ہے اور عورت کی آدھی زنانہ اور آدھی مردانہ خصوصیات سیاست اور معیشت کو خراب کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس سلسلہ میں گنتی کی چند سابقہ معروف خواتین کے نام گنانے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ جہاں لاکھوں کارکنوں کی ضرورت ہو، کیا وہاں تمام خواتین موزوں رہ سکیں گی؟ ابھی حال ہی میں مصر کے سرکاری محکموں اور تجارتی اداروں نے یہ شکایت کی ہے کہ وہاں بحیثیت مجموعی ایک

لاکھ دس ہزار خواتین جو مختلف مناصب پر کام کر رہی ہیں بالعموم ناموزوں ثابت ہو رہی ہیں اور ان کی کارکردگی مردوں کی بہ نسبت ۵۰ فیصدی سے زیادہ نہیں۔ پھر مصر کے تجارتی اداروں نے یہ عام شکایت کی ہے کہ عورتوں کے پاس پہونچ کر کوئی راز راز نہیں رہتا۔ مغربی ممالک میں جاسوسی کے جتنے واقعات پیش آتے ہیں ان میں بھی عموماً کسی نہ کسی طرح عورت کا دخل ہوتا ہے۔

عورتوں کی تعلیم سے اسلام ہرگز نہیں روکتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ان کو دلوائی جانی چاہیے لیکن چند شرطوں کے ساتھ، اوّل یہ کہ ان کو وہ تعلیم خاص طور پر دی جائے جس سے وہ اپنے دائرۂ عمل میں کام کرنے کے لیے ٹھیک ٹھیک تیار ہو سکیں اور ان کی تعلیم بعینہٖ وہ نہ ہو جو مردوں کی ہو، دوسرے یہ کہ تعلیم مخلوط نہ ہو اور عورتوں کو زنانہ تعلیم گاہوں میں عورتوں ہی سے تعلیم دلوائی جائے (مخلوط تعلیم کے مہلک نتائج مغربی ترقی یافتہ ممالک میں اس حد تک سامنے آچکے ہیں جو انسانیت کے لیے بدنما داغ ہیں)۔ مثلاً صرف امریکہ میں ۱۷ سال تک عمر کی لڑکیاں جو ہائی اسکولوں میں پڑھتی ہیں مخلوط تعلیم کی وجہ سے ہر سال ان میں سے اوسطاً ایک ہزار حاملہ نکلتی ہیں۔ گو ابھی یہ شکل ہمارے ہاں رونما نہیں ہوئی لیکن اس مخلوط تعلیم کے نتائج کچھ ہمارے سامنے بھی آنے شروع ہو گئے ہیں، تیسرے یہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین سے ایسے اداروں میں کام لیا جائے جو صرف عورتوں کے لیے ہی مخصوص ہوں۔ مثلاً زنانہ تعلیم گاہیں، اور زنانہ ہسپتال وغیرہ

لیڈر صاحبان کا حوالہ دے کر آپ نے جو سوال کیا ہے، اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اگر اسلامی تہذیب اسی چیز کا نام ہے جس کی پیروی یہ حضرات خود اور ان کی اتباع میں مسلمان آجکل کر رہے ہیں تو پھر اسلامی تہذیب اور یورپین تہذیب میں کوئی فرق نہیں ہے پھر تو مسلمانوں کو وہ سب کچھ کرنا چاہیے جو آج یورپ میں ہو رہا ہے۔ لیکن اگر اسلامی تہذیب اس تہذیب کا نام ہے جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے سکھائی تھی، تو آجکل کے میڈیکل کالجوں اور نرسنگ کی تربیت گاہوں اور ہسپتالوں میں مسلمان لڑکیوں کو بھیجنے سے لاکھ درجہ بہتر یہ ہے کہ ان کو قبروں میں دفن کر دیا جائے۔ رائج الوقت

گرلز کالجوں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے اور پھر معلمات بننے کا معاملہ بھی اس سے بہت مختلف نہیں ہے۔ البتہ اگر نظام تعلیم و تربیت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو اور ہم اپنے طریقہ پر لڑکیوں کو تیار کر کے ان سے تمدّن کے ضروری کاموں کی خدمت لینے پر قادر ہوں تو یقیناً ہم اس کا انتظام کریں گے کہ اسلامی حدود کی پابندی کرتے ہوئے لڑکیوں کو فن طب سرجری، قابلہ گری، نرسنگ اور تربیت اطفال کی تعلیم دیں۔ اور ان کو دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم و تربیت دے کر معلمات بھی بنائیں اور ان سے تمدن کی دوسری مختلف ضروری خدمات بھی ایسے طریقوں پر لیں جو اسلامی تہذیب کے مطابق ہوں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی ضمناً لائق تصریح ہے کہ ہم مسلمان اس مغربی نظریہ کے قائل نہیں ہیں کہ تیمار داری (نرسنگ) کا پیشہ عورت کے لیے مخصوص ہے اور یہ کہ زنانہ و مردانہ سب قسم کے اسپتالوں کے نرس عورت ہی ہونی چاہئے۔ ہمارے نزدیک اس خیال کے لیے کوئی علمی اور عقلی بنیاد نہیں ہے اور اخلاقی حیثیت سے یہ نہایت شرمناک ہے کہ نرس خواتین سے مرد بیماروں کی تیمارداری کے وہ کام لیے جائیں جنھیں مرد تیماردار بھی انجام دیتے ہوئے حجاب محسوس کریں اس بنا پر ہم مسلمان لوگ اگر عورتوں کو طبی خدمات کے لیے تیار کریں گے تو عورتوں کے علاج اور تیمارداری کے لیے کریں گے نہ کہ عام طبی خدمات کے لیے۔ ہمارے نزدیک مردانہ ہسپتالوں کے لیے مرد ہی نرس ہونے چاہئیں۔

جنگ کے موقع تیمارداری، مرہم پٹی، مجاہدوں کا کھانا پکانا، اسلحہ اور رسد رسانی پیغام رسانی وغیرہ کی خدمات انجام دینا عورتوں کے لیے جائز ہے۔ پردے کے احکام سے قبل بھی یہ خدمات عورتیں انجام دیتی تھیں اور ان احکام کے آنے کے بعد بھی دیتی رہیں اور آج بھی دے سکتی ہیں لیکن یہ جواز اس شرط کے ساتھ ہے کہ فوج اسلامی ہو، حدود اللہ کی پابند ہو اور ان بدمعاشیوں سے پاک ہو جن میں آج کل کی فوجوں نے ناموری حاصل کر رکھی ہے۔ W.A.C. کے معصوم نام سے عورتوں کو بھرتی کرنا اور پھر بدمعاش سپاہیوں اور افسروں کے لیے ان سے

قحبہ گری کی خدمت لینا وہ شیطانی کام ہے جس کے لیے کوئی گنجائش برائے نام بھی اسلامی تہذیب میں نہیں نکل سکتی ۔

اسلامی حکومت میں خواتین کی تنظیمیں اور غیر اسلامی رجحانات

سوال :۔ کیا اسلامی حکومت خواتین کی بڑھتی ہوئی آزادی کو سختی سے روکے گی، جیسے ان کی زیبائش اور نیم عریاں لباس زیب تن کرنے اور فیشن کا رجحان اور جیسے آجکل نوجوان لڑکیاں نہایت تنگ اور دل فریب سنٹ سے معطر لباس اور غازہ وسرخی سے مزین اپنے ہر خدوخال ونشیب و فراز کی نمائش برسر عام کرتی ہیں اور آجکل نوجوان لڑکے بھی ہالی وڈ فلموں سے متاثر ہو کر ٹیڈی بوائز بن رہے ہیں تو کیا حکومت قانون (LEGISLATION) کے ذریعہ سے ہر مسلم وغیر مسلم لڑکے ولڑکی کے آزادانہ رجحان کو روکے گی ؟ خلاف ورزی پر سزا دے گی ؟ والدین وسرپرستوں کو جرمانہ کیا جا سکے گا ؟ تو اس طرح کیا ان کی شہری آزادی پر ضرب نہ لگے گی ؟

ا ۔ کیا گرلز گائڈ ۔ اپوا A.P.W.A یا دیگر وائی ایم سی اے Y.M.C.A اور وائی ڈبلیو سی اے .Y.W.C.A جیسے ادارے اسلامی نظام میں گوارا کیے جا سکتے ہیں ؟ (ب) کیا خواتین خواہ اسلامی عدلیہ سے ہی سے سہی خود طلاق لینے کی مجاز ہو سکیں گی اور مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کی پابندی آج جائز ہو گی ؟ ج ۔ یا خواہ اسلامی عدالت کے روبرو ہی ان کو اپنی پسند سے (CIVII MARRIAGE کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے ؟ (د) کیا خواتین کو یوتھ فیسٹیول کھیلوں، نمائش، ڈراموں، ناچ، فلموں یا مقابلہ حسن میں شرکت یا ۔ AIR HOSTESS

وغیرہ بننے کی آج بھی اسلامی حکومت مخالفت کرے گی؟ (۷) ساتھ ہی قومی کردار
تباہ کرنے والے ادارے مثلاً سینما، فلمیں، ٹیلی ویژن، ریڈیو پر فحش گانے اور
عریاں رسائل و لٹریچر، موسیقی، ناچ رنگ کی ثقافتی محفلیں وغیرہ کو بند کر دیا
جائے گا یا فائدہ اٹھانا ممکن ہو گا؟

جواب : اسلام معاشرہ کی اصلاح و تربیت کا سارا کام محض قانون کے ڈنڈے سے نہیں لیتا۔ تعلیم، نشر و اشاعت اور رائے عام کا دباؤ اس کے ذرائع اصلاح میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام ذرائع کے استعمال کے بعد اگر کوئی خرابی باقی رہ جائے تو وہ قانونی وسائل اور انتظامی تدابیر استعمال کرنے میں بھی تامل نہ کرے گا۔ عورتوں کی عریانی اور بیحیائی فی الواقع ایک بہت بڑی بیماری ہے جسے کوئی سچی اسلامی حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بیماری اگر دوسری تدابیر اصلاح سے درست نہ ہو یا اس کا وجود باقی رہ جائے تو یقیناً اس کو ازروئے قانون روکنا پڑے گا۔ اس کا نام اگر شہری آزادی پر ضرب لگانے کے مترادف ہے تو جواریوں کو پکڑنا اور جیب کتروں کو سزائیں دینا بھی شہری آزادی پر ضرب لگانے کے مترادف ہے۔ اجتماعی زندگی لازماً افراد پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے، افراد کو اس کے لیے آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور دوسروں سے سیکھی ہوئی برائیوں سے اپنے معاشرہ کو خراب کریں۔

گرلز گائیڈز (GIRL GUILES) کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ اپوا A.P.W.A قائم رہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر کام کرے اور قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف طریقے استعمال کرنا چھوڑ دے۔ (Y.W.C.A) عیسائی عورتوں کے لیے رہ سکتا ہے مگر کسی مسلمان عورت کو اس میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مسلمان عورتیں چاہیں تو YWMA بنا سکتی ہیں بشرطیکہ اسلامی حدود میں رہیں۔

NULIFICATION

مسلمان عورت اسلامی عدلیہ کے ذریعہ سے خلع حاصل کر سکتی ہے۔ فسخ نکاح

اور تفریق JUDICIAL SEPARATION کی ڈگری بھی عدالت سے حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ان میں سے کوئی ڈگری حاصل کرنے کی مجاز ہو، لیکن طلاق (DIVORCE) کے اختیارات قرآن نے صریح الفاظ میں صرف مرد کو دیئے ہیں۔ اور کوئی قانون مرد کو اس اختیار سے محروم نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ قرآن کا لکر قرآن کے خلاف قوانین بنائے جانے لگیں۔ پوری اسلامی تاریخ عہد رسالت سے لے کر اس صدی تک اس تصور سے نا آشنا ہے کہ طلاق دینے کا حق مرد سے سلب کر لیا جائے۔ اور کوئی عدالت یا پنچایت اس میں دخل دے۔ یہ تخیل سیدھا یورپ سے چل کر ہمارے یہاں درآمد ہوا ہے اور اس کے درآمد کرنیوالوں نے کبھی آنکھیں کھول کر یہ نہیں دیکھا ہے کہ یورپ میں اس قانون طلاق کا پس منظر BACK GROUND کیا ہے اور وہاں اس کے کتنے برے نتائج رونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جب گھروں کے سکنڈل نکل کر بازاروں میں پہنچیں گے تو لوگوں کو پتہ چلے گا کہ خدا کے قوانین کی نافرمانی کے کیا نتائج ہونے رہیں۔

مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کے معاملہ میں از روئے قانون پابندی عائد کرنے کا یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کا تخیل بھی ایک بیرونی مال ہے جسے قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا گیا ہے۔ یہ اسی سوسائٹی میں سے آیا ہے جس میں ایک ہی عورت اگر منکوحہ بیوی کے ساتھ داشتہ کے طور پر رکھی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ قابل برداشت ہے۔ بلکہ اس کے حرامی بچوں کی حقوق محفوظ کرنے کی بھی فکر کی جاتی ہے۔ (فرانس کی مثال ہمارے سامنے ہے) لیکن اگر اسی عورت سے نکاح کر لیا جائے تو یہ جرم ہے گویا ساری پابندیاں حلال کے لیے ہیں حرام کے لیے نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کی ابجد سے بھی واقف ہو تو کیا وہ یہ اقدار NATUES اختیار کر سکتا ہے؟ کیا اس کے نزدیک زنا قانوناً جائز اور نکاح قانوناً حرام ہونے کا عجیب و غریب فلسفہ برحق ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے قوانین بنانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ مسلمانوں میں زنا کا رواج بڑھے گا۔ گرل فرینڈز اور داشتائیں MISTRESSES فروغ پائیں گی اور دوسری بیوی ناپید ہو جائے گی۔ یہ

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہوگی جو اپنے خد و خال میں اسلام کی اصل سوسائٹی سے بہت دور اور مغربی سوسائٹی سے بہت قریب ہوگی۔ اس صورتحال کے تصور سے جس کا جی چاہے مطمئن ہو مسلمان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سول میرج کا سوال ظاہر ہے کہ مسلمان عورت کے ساتھ تو پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال اگر پیدا ہوتا ہے تو مشرک عورت سے شادی کرنے کے معاملہ میں یا کسی ایسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کے معاملہ میں جو اسلامی قانون کے تحت کسی مسلمان سے نکاح کرنے کے لیے تیار نہ ہو اور مسلمان مرد اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس اقرار کے ساتھ شادی کرے کہ وہ کسی مذہب کا پابند نہ ہوگا۔ یہ کام اگر کسی کو کرنا ہی ہو تو اسے اسلام سے فتویٰ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسلام کیوں اپنے ایک پیرو کو اس کی اجازت دے؟ اور ایک اسلامی عدالت کا کام کب ہے کہ مسلمانوں کی اس طریقہ پر شادیاں کروائے؟

اگر ایک اسلامی حکومت بھی یوتھ فیسٹول (YOUTH FESTIVAL) اور کھیلوں کی نمائشوں اور ڈراموں اور رقص و سرود اور مقابلہ حسن میں مسلمان عورتوں کو لائے، یا ایئر ہوسٹس (AIR HOSTESS.) بنا کر مسلمانوں کے دل موہنے کی کوشش کرے تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلامی حکومت کی ضرورت کیا ہے؟ یہ سارے کام کفر اور کفار کی حکومت میں بہ آسانی ہو سکتے ہیں بلکہ زیادہ آزادی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

سینما، فلم، ٹیلی ویژن اور ریڈیو وغیرہ تو خدا کی پیدا کردہ طاقتیں ہیں جن میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں۔ خرابی ان کے اس استعمال میں ہے جو انسانی اخلاق کو تباہ کرنے والا ہے اسلامی حکومت کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ان ذرائع کو انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کرے اور اخلاقی فساد کے لیے استعمال ہونے کا دروازہ بند کر دے۔

اسلامی حکومت میں ضبطِ تولید

سوال : دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے آج اسلام کیا حل پیش کرتا ہے ؟ 1 - برتھ کنٹرول (پیدائش روکنے) کے لیے دواؤں کا استعمال فیملی پلاننگ وغیرہ کو کیا آج بھی غیر شرعی قرار دے کر ممنوع قرار دیا جائے گا؟

جواب : دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کا اسلام صرف ایک ہی حل پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے اپنے رزق کے جو ذرائع پیدا کیے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور استعمال کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور جو ذرائع اب تک مخفی ہیں ان کو دریافت کرنے کی پیہم سعی کی جاتی رہے۔ آبادی روکنے کی ہر وہ کوشش خواہ وہ قتل اولاد ہو یا اسقاط حمل ہو یا منع حمل، غلط ہے اور بے حد تباہ کن۔ ضبطِ ولادت کی تحریک کے چار نتائج ایسے ہیں جس کو رونما ہونے سے کسی طرح نہیں روکا جا سکتا۔ (۱) زنا کی کثرت (۲) انسان کے اندر خود غرضی اور اپنا معیار زندگی بڑھانے کی خواہش کا اس حد تک ترقی کر جانا کہ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ اور اپنے یتیم بھائیوں اور اپنے دوسرے محتاج امداد رشتہ داروں کا وجود بھی ناگوار گزرنے لگے۔ کیونکہ جو آدمی اپنی روٹی میں خود اپنی اولاد کو شریک کرنے کے لیے تیار نہ ہو وہ دوسروں کو بھلا کیسے شریک کر سکے گا۔ (۳) آبادی کے اضافے کا کم سے کم مطلوبہ معیار بھی جو ایک قوم کو زندہ رکھنے کے لیے ناگزیر ہے برقرار نہ رہنا۔ اس لیے کہ جب یہ فیصلہ کرنے والے افراد ہوں گے کہ وہ کتنے بچے پیدا کریں اور کتنے نہ کریں۔ اور اس فیصلہ کا مدار اس بات پر ہو گا کہ وہ اپنے معیار زندگی کو نئے بچوں کی آمد کی وجہ سے گرنے نہ دیں تو بالآخر وہ اتنے بچے بھی پیدا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے جتنے ایک قوم کو اپنی قومی آبادی برقرار رکھنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ اس طرح کے حالات میں کبھی کبھی نوبت یہ بھی آجاتی ہے کہ شرح پیدائش شرح اموات سے کمتر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ فرانس دیکھ چکا ہے حتیٰ کہ اس کو "بچے زیادہ پیدا کرو" کی تحریک چلانی پڑی اور انعامات کے

ذریعہ سے اس کی ہمت افزائی کرنے کی ضرورت پیش آگئی (۴) قومی دفاع کا کمزور ہو جانا یہ نتیجہ خصوصی طور پر کسی ایسی قوم کے لیے بے حد خطرناک ہے جو اپنے سے تیرہ گنی زیادہ دشمن آبادی میں گھری ہوئی ہو۔

موت کے بعد انسانی اعضاء کا استعمال و عطیّہ

سوال : کیا ایک مسلمان زندگی میں اپنی آنکھیں عطیہ کر سکتا ہے کہ اس کی موت کے بعد کسی اندھے یا مریض کے لیے استعمال ہو سکیں؟ ا۔ اس طرح بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے انسانی اعضاء کی قربانی روزِ قیامت سزا کی مستحق تو نہ ہوگی؟ ب۔ موت کے بعد ایک مسلمان کی لاش کا پوسٹ مارٹم یا ریسرچ کے لیے چیر پھاڑ مذہبی نقطۂ نگاہ سے کیا اہمیت رکھتا ہے؟

جواب : آنکھوں کے عطیہ کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی محدود نہیں رہتا بہت سے دوسرے اعضا بھی مریضوں کے کام آسکتے ہیں اور ان کے دوسرے مفید استعمال بھی کرسکتے ہیں۔ یہ دروازہ اگر کھولا جائے تو مسلمانوں کا قبروں میں دفن ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا سارا جسم ہی چندے میں تقسیم ہونا شروع ہو جائے گا۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں ہے، اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مرنے سے قبل اپنے جسم کو تقسیم کرنے یا چندہ دینے کی وصیت کرے جسم اس وقت تک اس کے تصرف میں ہے جب تک وہ جسم میں خود رہتا ہے اس کے نکل جانے کے بعد اس جسم پر اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ اس کے معاملے میں اس کی وصیت نافذ ہو۔ اسلامی احکام کی رو سے اس کا جسم احترام کے ساتھ دفن کر دینا چاہئے۔

اسلام نے انسانی لاش کی حرمت کا جو حکم دیا ہے وہ دراصل انسانی جان کی حرمت کا ایک لازمہ ہے۔ ایک دفعہ اگر انسانی لاش کا احترام ختم ہو جائے تو بات صرف اس حد تک محدود نہ رہے گی کہ مردہ انسانوں کے بعض کارآمد اجزا زندہ انسانوں کے علاج میں استعمال کیے جانے لگیں گے بلکہ رفتہ رفتہ انسانی جسم کی چربی

صابن بننے لگیں گے (جیسے کہ فی الواقع جنگ عظیم نمبر ۲ کے زمانے میں جرمنوں نے بنائے تھے) انسانی کھال بھی اتار کر اس کو دباغت دینے کی کوشش کی جائے گی تاکہ اس کے جوتے یا سوٹ کیس یا منی پرس بنائے جاسکیں۔ (چنانچہ یہ تجربہ بھی چند سال قبل مدراس کی ایک ٹینری کر چکی ہے)۔ انسان کی ہڈیوں اور آنتوں اور دوسری چیزوں کو استعمال کرنے کی بھی فکر کی جائیگی، حتیٰ کہ اس کے بعد ایک مرتبہ انسان پھر اس دور وحشت کی طرف پلٹ جائے گا جب آدمی آدمی کا گوشت کھاتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک دفعہ مردہ انسان کے اعضاء نکال کر علاج میں استعمال کرنا جائز قرار دیدیا جائے تو پھر کس جگہ حد بندی کر کے آپ اس جسم کے دوسرے "مفید" استعمالات کو روک سکیں گے اور کس منطق سے اس بندش کو معقول ثابت کریں گے۔

قرآن وحدیث اور سائنٹیفک حقائق

سوال : قرآن اور حدیث میں بہت سے ایسے امور بیان ہوئے ہیں جنھیں زمانۂ حال کی تحقیقات غلط قرار دیتی ہیں اس صورت میں ہم قرآن وحدیث کو مانیں یا علمی تحقیق کو؟ مثلاً

ا۔ قرآن کہتا ہے کہ نوع انسانی آدم سے پیدا ہوئی۔ بخلاف اس کے علماء دورِ حاضر کا دعویٰ ہے کہ انسان حیوانات ہی کے کنبہ سے تعلق رکھتا ہے اور بندروں اور بن مانسوں سے ترقی کرتے کرتے آدمی بنا ہے۔ ب۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ آفتاب حرکت کرتا ہے مگر سائنس کہتی ہے کہ نہیں، آفتاب ساکن ہے۔ ج۔ اسی طرح بادلوں میں جو کڑک اور چمک ہوتی ہے اس کے متعلق اسلام کی رائے یہ ہے کہ یہ بادلوں کو ہنکانے ہوئے فرشتوں کے کوڑے چمکتے اور آواز نکالتے ہیں حالانکہ زمانۂ حال کی تحقیق کہتی ہے کہ رعد اور برق کا ظہور بادلوں کے ٹکرانے سے ہوتا ہے

جواب : مجھے تو اپنی پچیس سالہ علمی تحقیق و تفتیش کے دوران میں آج تک ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی ہے کہ سائنٹیفک طریقہ سے انسان نے کوئی حقیقت ایسی دریافت کی ہو جو قرآن کے خلاف ہو۔ البتہ سائنسدانوں اور فلسفیوں نے قیاس سے جو نظریے قائم کئے ہیں ان میں سے متعدد

ایسے ہیں جو قرآن کے بیانات سے ٹکراتے ہیں۔ لیکن قیاسی نظریات کی تاریخ خود اس بات پر شاہد ہے کہ ایک وقت جن نظریات کو حقیقت سمجھ کر ان پر ایمان لایا گیا دوسرے وقت خود وہی نظریات ٹوٹ گئے اور آدمی ان کے بجائے کسی دوسری چیز کو حقیقت سمجھنے لگا۔ ایسی ناپائیدار چیزوں کو ہم یہ مرتبہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ قرآن کے بیانات سے ان کی پہلی ٹکر ہوتے ہی قرآن کو چھوڑ کر ان پر ایمان لے آئیں۔ ہمارا ایمان اگر متزلزل ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ کسی ثابت شدہ حقیقت سے، یعنی کسی ایسی چیز سے جو تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہو چکی ہو، قرآن کا کوئی بیان غلط قرار پائے، مگر جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں، ایسی کوئی چیز آج تک میرے علم میں نہیں آئی ہے۔

اب فرداً فرداً ان چیزوں کے متعلق کچھ عرض کر دوں جنھیں آپ نے مثال میں پیش کیا ہے۔

ا۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقا، اس وقت تک محض نظریہ ہے، ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ علی گڈھ جہاں سے آپ یہ خط لکھ رہے ہیں، ایک علمی مرکز ہے۔ وہاں اس نظریہ پر ایمان لانے والوں کی اچھی خاصی تعداد آپ کو ملے گی۔ آپ خود انہی سے پوچھ لیجئے کہ یہ نظریہ (THEORY) ہے یا یہ واقعہ (FACT) اگر ان میں کوئی صاحب اسے واقعہ قرار دیں تو ذرا ان کا اسم گرامی مجھے بھی لکھ دیجئے۔

ب۔ علی گڈھ میں فلکیات ASTRONOMY جاننے والوں کی بھی کمی نہیں، ذرا ان لوگوں سے پوچھئے کہ کیا واقعی آفتاب ساکن ہے؟ اگر ایسے کوئی صاحب مل سکیں تو ان کے نام نامی سے بھی علمی دنیا کو ضرور مطلع کرنا چاہئے۔ غالباً آپ ابھی تک انیسویں صدی کے سائنس کو سائنس سمجھ رہے ہیں جبکہ آفتاب متحرک نہ تھا۔ موجودہ سائنس کا آفتاب تو اچھی خاصی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔

ج۔ قرآن مجید کی کوئی آیت میرے علم میں ایسی نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ بادلوں میں

چمک اور کڑاک بجلی کے بجائے فرشتوں کے کوڑے برسانے سے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید میں بارش کا جو عمل (PROCESS) بیان کیا گیا ہے وہ بالکل ٹھیک ٹھیک موجودہ زمانہ کی سائنٹیفک تحقیقات کے مطابق ہے۔ اور اتنا جدید UP-TO-DATE ہے کہ پچھلی صدی کے وسط تک جو معلومات انسان کے پاس بارش کے متعلق تھیں ان کی بنا پر بعض لوگوں کو ان آیات کی تفسیر میں سخت پریشانی پیش آتی تھی جن میں بارش کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

آلات کے ذریعہ توالد و تناسل

سوال :۔ کیمیاوی آلات کے ذریعہ سے اگر مرد کا نطفہ کسی عورت کے رحم میں پہونچا دیا جائے اور اس سے اولاد پیدا ہو تو یہ عمل معصیت سے خالی ہونے کی وجہ سے مباح ہے یا نہیں ؟ اور اس عمل کی معمولہ زانیہ شمار کی جائیگی اور اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں ؟ اس امر کا خیال رکھئے کہ آج کل کی فیشن دار عورت مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے وہ اگر سائنٹیفک طریقے سے اپنے حصہ کا نسل بڑھانے کا فریضہ ادا کر دے تو پھر اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ امریکہ میں اس طرح پیدا ہونے والی اولاد کو از روئے قانون جائز اولاد تسلیم کیا گیا ہے"

جواب : آلات کے ذریعہ استقرار حمل کا جواز تو دور رہا، میرے لیے اس عمل کا تصور ہی ناقابل برداشت ہے کہ عورت گھوڑی کے مرتبے تک گرا دی جائے۔ آخر انسان کی صنف اناث اور حیوانات کی مادہ میں کچھ تو فرق رہنے دیجئے۔ حیوانات میں بھی اللہ تعالیٰ نے توالد و تناسل کا جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ نر اور مادہ کے اجتماع کا طریقہ ہی ہے۔ یہ انسان کی خودغرضی ہے کہ وہ گھوڑیوں کو اپنے نروں سے ملنے کا لطف حاصل کرنے نہیں دیتا۔ اور ان سے صرف نسل کشی کا کام لیتا ہے۔ اب اگر انسان کی اپنی "مادہ" کے ساتھ بھی یہی برتاؤ

شروع ہو جائے تو اس کے معنی انسانیت کی انتہائی تذلیل کے ہیں۔

آج کی "فیشن دار" عورت جو مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے، دراصل اس کی فطرت کو مصنوعی، فکری و صنفی ماحول نے مسخ کر دیا ہے۔ ورنہ وہ اگر صحیح انسانی فطرت پر ہوتی تو اس قسم کی گری ہوئی خواہش کو دل میں جگہ دینا تو درکنار، ایسی تجویز سننا بھی گوارا نہ کرتی۔ عورت محض نسل کشی کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت اور مرد کا تعلق انسانی تمدن کی بنیاد ہے۔ فطرت الٰہی نے عورت اور مرد کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ ان میں مودت اور رحمت ہو، حسن معاشرت ہو، مل کر گھر بنائیں، گھر سے خاندان اور خاندان سے سوسائٹی نشوونما حاصل کرے، اس مقصد کو ضائع کر کے عورت کو محض نسل کشی کا آلہ بنا دینا "فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ" (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو بدل دینے) کا مصداق ہے۔ جسے قرآن ایک شیطانی فعل قرار دیتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا طریقہ مقرر فرمایا ہے۔ لہٰذا وہی اولاد جائز اولاد ہے جو قید نکاح میں پیدا ہو، اسی سے وراثت اور نسب کی تحقیق ہوتی ہے۔ اگر آلہ کے ذریعہ سے بچہ پیدا کیا جائے تو اسے حلال نہیں کہا جا سکتا۔ شرعی نقطۂ نظر سے وہ حرامی ہی کہا جائے گا۔ نیز اس کا سلسلہ آبائی منقطع ہوگا اور وہ باپ کے ورثہ سے محروم رہے گا جو قطعی طور پر اس کی حق تلفی ہے۔

پھر غور تو کیجئے کہ جس بچہ کا کوئی باپ نہ ہو اس کی تربیت کا ذمہ دار کون ہوگا؟ صرف ماں؟ کیا یہ ظلم نہیں کہ خدا نے انسان کے بچہ کے لیے ماں اور باپ، چچا اور ماموں، دادا اور نانا، وغیرہ لوگوں کی صورت میں جو مربی پیدا کیے ہیں ان میں سے آدھے ساقط کر دیئے جائیں اور وہ صرف سلسلہ مادری پر منحصر رہ جائے؟ کیا دنیا سے پدری محبت، پدرانہ ذمہ داریوں اور پدرانہ اخلاق کو فنا کر دینا انسانیت کی کوئی خدمت ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت پر ماں ہونے کی ذمہ داری تو قائم رہے مگر مرد ہمیشہ کے لیے باپ ہونے کی ذمہ داری سے

سبکدوش ہو جائے۔

پھر اگر یہی سلسلہ چل پڑا تو ایک روز عورت مطالبہ کرے گی کہ کوئی ترکیب ایسی ہونی چاہیئے کہ انسان کا بچہ میرے رحم میں پرورش پانے کے بجائے امتحانی نلیوں" میں پالا جائے یعنی انسان کیمیاوی معمل میں پیدا ہونے لگے۔ اور جب تک یہ حالت پیدا نہیں ہوتی عورت چاہے گی کہ اسے صرف بچہ جننے کی تکلیف دی جائے۔ اس کے بعد ماں کے فرائض انجام دینے کے لیے وہ تیار نہ ہو گی۔

یہ صورت جب رونما ہو گی تو انسانی بچے اسی طرح "کثیر پیداواری (MASS PRODU-CTION)" کے اصول پر فیکٹریوں میں ڈھل ڈھل کر نکلیں گے جس طرح اب جوتے اور موزے نکلتے ہیں یہ انسانیت کے تنزل کا آخری مقام، اس کا اسفل السافلین ہو گا۔ ان کارخانہائے "نسل کشی" سے انسان نہیں بلکہ دو ٹنگے جانور پیدا ہوں گے جن میں انسانی شرف اور پاکیزہ انسانی جذبات واحساسات کی خوشبو برائے نام بھی نہ ہو گی۔ اور سیرت کا وہ تنوع ناپید ہو گا جو تمدن کی رنگارنگ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کارخانوں سے کسی ارسطو اور ابن سینا، کسی غزالی اور رازی، کسی ہیگل اور کانٹ کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میرے خیال میں تو وہ مادہ پرستانہ تہذیب لعنت سمجھنے کے قابل ہے جس کے زیر سایہ ایسی تجویزیں انسان کے دماغ میں آتی ہیں ـــــ اس قسم کی تجویزوں کا انسانی دماغوں میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس تہذیب نے انسان کے ذہن میں خود انسانیت کے تصور کو نہایت پست اور ذلیل کر دیا ہے۔

اسلام اور آلات موسیقی

سوال: (۱) کیا آلات موسیقی بنانا اور ان کی تجارت کرنا جائز ہے؟۔

(۲) کیا شادی کے موقعے پر باجے وغیرہ بجانا جائز ہے؟ نیز تفریحاً اس کا استعمال

کیسا ہے ؟

(۳) اگر جواب نفی میں ہو تو ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے جو خود تو ان کا استعمال نہیں کرتے لیکن ایسے تعلق داروں کے ہاں بخوف کشیدگی چلے جاتے ہیں جو آلاتِ موسیقی کا استعمال کرتے ہیں۔

(۴) کیا ہمارے لیے ایسے نکاح میں شامل ہونا کی اجازت ہے جہاں آلاتِ موسیقی کا استعمال ہو رہا ہو ؟

(۵) آلات لہو کے حامیوں کا خیال ہے کہ چونکہ آنحضورؐ کے زمانہ میں دف ہی ایک موسیقی کا آلہ عرب میں رائج تھا اور آپ نے اس کے استعمال کی اجازت دی ہے لہٰذا ہمارے زمانے میں دف کی اگر متعدد ترقی یافتہ شکلیں مستعمل ہو گئی ہیں تو ان کا استعمال کیوں ناروا ہو ؟

(۶) کیا دف آلات لہو میں شامل ہے ؟

جواب : (۱) حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں آلات موسیقی کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہوں"۔ اب یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ جو نبی اس کام کے لیے بھیجا گیا ہو اس کے پیرو انہی آلات کو بنانے اور بیچنے اور بجانے کے لیے اپنی قوتیں استعمال کریں۔ (۲) شادی بیاہ ہو یا کچھ اور، باجے بجانا کسی حال میں درست نہیں۔ حدیث میں جس حد تک اجازت پائی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ شادی اور عید کے موقع پر دف کے ساتھ کچھ گا بجا لیا جائے (۳) یہ محض ایمان کی کمزوری ہے۔ جو رسول اور اصحابِ رسول کے ساتھ اپنا حشر چاہتے ہوں ان کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ ایسے لوگوں سے ربط ضبط نہ رکھیں جنھیں احکام شریعت کی پروا نہیں ورنہ جن کو ان لوگوں کے تعلقات زیادہ عزیز ہیں انھیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فاجرین اور صالحین کے ساتھ بیک وقت تعلق نہیں رکھا جا سکتا جب تمھاری دنیا فاجروں کے ساتھ ہے تو آخرت میں بھی انھیں کا ساتھ نصیب ہو گا۔

(۴) جواب نمبر ۳ ملاحظہ ہو، مگر یہ خیال رہے کہ مجلس نکاح میں جبکہ ایجاب قبول ہو رہا ہو اور منکرات و فواحش کی نمائش نہ ہو رہی ہو شرکت کرنے میں مضائقہ نہیں۔ بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ شرکت کی جائے اور جب موسیقی شروع ہو تو نہایت نرمی اور شرافت کے ساتھ یہ کہہ کر دوستوں اور عزیزوں سے رخصت چاہی جائے کہ جہاں تک تمہارے جائز کاموں کا تعلق ہے ہم تمہاری مسرت میں دل سے شریک ہیں اور جہاں تک ناجائز کاموں کا تعلق ہے ہم ان میں نہ خود شریک ہونا پسند کرتے ہیں اور نہ یہ گوارا کرتے ہیں کہ تم ان خرابیوں میں مبتلا ہو۔

(۵) یہ محض غلط ہے کہ دف کے سوا اس زمانہ میں اور کوئی دوسرا آلۂ موسیقی نہ تھا ایران اور مصر کی تمدنی تاریخ اور خود عرب جاہلیت کی تمدنی تاریخ سے جو شخص جاہل محض ہو وہی یہ بات کہہ سکتا ہے ورنہ متعدد باجوں کے نام تو خود اشعار جاہلیت میں ملتے ہیں

(۶) دف کا نام اگر آلات موسیقی میں شامل ہو بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے شادی بیاہ اور عید کے موقع پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے۔ اور یہ زیادہ سے زیادہ حد ہے جہاں تک آدمی جا سکتا ہے۔ اس آخری حد کو جو شخص نقطۂ آغاز بنانا چاہتا ہو، اس کو آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ خواہ مخواہ اس نبی کے پیروؤں میں اپنا نام لکھوائے جو آلات موسیقی توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔؟